انقلاب کیلئے تیاری

تعارف

بجلی اور پیٹرول کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف جب محنت کش احتجاج کرتے ہیں تو پیپلز پارٹی حکومت کے ذمہ داران یہ کہتے ہیں "ہم کیا کریں یہ تو پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ہم نے پیٹرول کی قیمتوں کو عالمی سطح پر قیمتوں سے منسلک کر دیا ہے۔ بجلی کی قیمتوں میں اس لئے اضافہ کر رہے ہیں کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک بجلی کی قیمتوں میں حکومتی سبسڈی کے خاتمے کا مطالبہ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے قیمتیں بڑھ رہی ہیں"۔ یوں واضح ہوتا ہے کہ حکمران طبقات عالمی سطح پر ہونے والے واقعات کو ایک سیاسی جواز کے طور پر پیش کرتے ہیں اور مہنگائی کرنے کی وجہ بھی عالمی حالات پر ڈال دی جاتی ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ پاکستان کے حالات عالمی سطح پر ہونے والے سیاسی و معاشی و ثقافتی حالات سے جڑے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہم عالمی حالات کا بغور مطالعہ کریں اور اس کا حقیقی ادراک کرتے ہوئے محنت کش طبقہ کو واضح کریں کہ پاکستان میں محنت کش انقلاب عالمی انقلاب سے جڑا ہوا ہے۔ سوشلزم کی جدوجہد جس قدر عالمی بنیادیں آج حاصل کر چکی ہے اس سے قبل کبھی بھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔

اس وقت دنیا ایک عظیم تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ایک ایسا "مکمل طوفان" جو معاشرے کو ٹکڑوں میں چیر پھاڑ کرنے کی نوید دیتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ انسانی تہذیب کی بقا بذات خود ایک سوالیہ نشان بن چکی ہے۔ اس دستاویز کو تیار کرنے میں دنیا کے مختلف ممالک میں موجود سوشلسٹ کارکنوں نے تفصیلی بحث و مباحثہ کیا ہے۔ اس دستاویز کو اس لئے پیش کیا جا رہا ہے کہ لیبر پارٹی پاکستان کے ممبران عالمی حالات کو دیکھتے ہوئے پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کی راہیں درست کر سکیں اور اسے زیر بحث لا کر ایسے نتائج اخذ کریں جس سے پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد کی عالمی بنیادیں واضح ہو سکیں۔ یہ دستاویز سوشلزم پر پختہ یقین رکھنے والوں کو آپس میں جوڑنے اور نظریاتی اتحاد کو مزید پکا کرنے کے لئے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ دستاویز نہ صرف باہمی مشورے اور ایک دوسرے کی نظریاتی مدد کا ذریعہ بنے گی بلکہ بسا اوقات عملی اقدامات کے لئے مشعل راہ بھی ثابت ہو گی۔ یہ دستاویز انتہائی اہمیت کے حامل نظریات اور تجربات کے باہمی تبادلے کے لئے خاطر خواہ لوازم بھی مہیا کرتی ہے۔

لیبر پارٹی پاکستان سوشلزم پر یقین رکھنے والے ان تمام کارکنوں پر مشتمل ہے جو ماضی میں ایک جیسی روایات، حکمت عملی اور طریقہ کار کے حامل نہ تھے مگر اس کے باوجود ایک عرصہ گزرنے کے بعد ہم سب ایک جیسی

سوچ و فکر پر متفق ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ خیالات و نظریات کی ہم آہنگی کے پیش نظر جھجک کے بغیر واضح سمجھ آنے والے نظریات کو مکمل کر کے پیش کیا جائے۔

یہ کام وقت کے عین مطابق ہے کیونکہ ہم اپنے آپ کو تاریخ کے اس موڑ پر پاتے ہیں جہاں رک کر گزرے ہوئے حالات سے حاصل کئے گئے سبق پر غور کرنے کو ترجیح دی جائے اور ایک بیلنس شیٹ تیار کی جائے کہ کیا کھویا ہے؟ کیا پایا ہے؟ ضروری ہے کہ ہم اپنے تمام تر بنیادی اصولوں کا از سر نو جائزہ لیں اور مرکزی قوتوں اور ان کے توازن کو مد نظر رکھ کر سر دست مستقبل قریب میں پیش آنے والے حالات کے مطابق لائحہ عمل تیار کریں۔ اگر عالمی معاشی سرمایہ دارانہ نظام اچانک ناکامی سے دوچار ہوا یا دھماکے سے پھٹ پڑے تو ایسی طبقاتی جدوجہد دیکھنے کو مل سکتی ہے جو شاید گزشتہ 70 سالوں میں دیکھنے میں نہ آئی ہو۔ ایسی صورتحال کے پیش نظر ہمیں پوری طرح عملیت پسند موقف اپنانے کی ضرورت ہے۔

ایسی مربوط سیاسی تحریک، جو ہمارے مطلوبہ مقاصد کو حاصل کر سکے، کی تعمیر کیلئے معاشرہ کو روزمرہ زندگی میں جن نئے پیچیدہ سوالات کا سامنا ہے ان کے جوابات جاننے کی ضرورت ہے۔ ایسے جوابات جو ہمارے نظریات کے موجودہ پھیلاؤ سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں نہ صرف پاکستان میں ایک انقلابی پارٹی کی ضرورت ہے بلکہ ایک ورلڈ پارٹی کی ضرورت ہے۔ چاہے یہ پارٹی ماں کے پیٹ میں بچے کے سائز کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال اس سلسلے میں کسی قسم کے حیلے بہانے کی گنجائش نہیں یا اس کا کوئی نکوئی متبادل تعمیر کرنا ضروری ہے۔

ایسے ہم خیال افراد کا اکٹھا ہونا ضروری ہے جو ایک نقطے پر متفق ہوں۔ یہ نظریات اور خیالات بالکل سیدھے سادھے طریقے سے پیش ہوں جن سے مستقبل میں پارٹی کا ہر اول دستہ کارکن مسلح ہو سکیں اور یہ ان کے لئے بھی مفید ہوں جو ہم آہنگ مقاصد رکھنے والے کارکن ہوں۔ آئندہ بہتر طرح سے متوازن اور معقول معاشرے کی تشکیل کے بارے میں سوچ رکھتے ہوں۔

زمانہ قدیم سے تاریخ کا مطلب ہی طبقات کے مابین کشمکش ہے۔ پرولتاری طبقہ جو اپنی روزی جائیداد کی ملکیت کی وجہ سے نہیں بلکہ ہاتھوں سے کام کر کے یا اپنی ذہنی صلاحیت بروئے کار لا کر اور اپنی قوت محنت کو بیچ کر روزانہ یا ماہانہ معاوضے کی بنیاد پر زندہ رہتے ہیں جبکہ سرمایہ داری نظام کے بحران کے زمانہ میں ان محنت کشوں کی روزی ہی خطرات سے دوچار ہو جاتی ہے۔ سرمایہ داری نظام عرصہ ہوا اپنے اندر پھیلاؤ و ترقی کی حدود کو چھو چکا ہے۔ انسانی ترقی کو مزید آگے لے جانے والی قوت صرف اور صرف محنت کش طبقہ کی صلاحیت کار ہے۔ محکوم اور پسے ہوئے طبقات کو آزاد کرانے، کرہ ارض کو جنگوں اور ماحولیاتی تباہی سے ایک نیا سماجی نظام کا قیام ہی بچا سکتا ہے۔ ایک ایسا نظام جو تمام انسانوں کے ایک ہونے پر قائم ہو۔ اس سلسلے میں پہلا قدم محنت کشوں کی جمہوری

حکومت کا قیام ہے جو معیشت کے انتہائی اہم شعبوں کو حکومت کے کنٹرول میں لے لے جو محنت کشوں کے زیرِ انتظام ہوگا۔ صرف محنت کشوں کے زیرِ انتظام ہی خدمات کے ٹکنگی ایک مہذب معاشرے کی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں۔ صرف اس طریقے سے ہی انسانی صلاحیتوں کا مکمل استعمال بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ محنت کشوں کا جہاں کہیں بھی استحصال ہو رہا ہے وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے متحد ہو جاتے ہیں۔ ہماری پارٹی محنت کشوں کی ماضی میں کی گئی جدوجہد کو پیشِ نظر رکھ کر قائم ہوئی ہے۔ سرمایہ داری نظام کے خاتمے کے لئے مخلصانہ جدوجہد کرنے والوں کو ہم رابطے اور بحث کرنے کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ ایسے اصول تلاش کر سکتے ہیں جو سب کے لئے مشترک حیثیت اور اہمیت کے حامل ہوں۔

محنت کش طبقہ میں ایسی صلاحیت اور طاقت موجود ہے کہ وہ تمام کرۂ ارض پر اپنا اقتدار قائم کر سکے ہیں۔ صنعت کا پھیلاؤ عالمی سطح پر ہو چکا ہے اور آبادی کے لحاظ سے بڑی پرتیں ملٹی نیشنل کمپنیوں میں بطور ورک فورس بھرتی ہو چکی ہیں۔ پیداواری قوتیں عالمی سطح پر باہم رابطے قائم کر چکی ہیں۔ پیداوار کا ہر شعبہ باہمی تعاون کے سلسلہ میں ایک دوسرے پر انحصار کرنے لگا ہے۔ اجارہ داریوں نے مسابقت سے سرمایہ دارانہ مقابلہ بازی کی جگہ لے لی ہے یعنی ذرائع پیداوار پر نجی قبضہ قائم رکھنے کا پرانا اور روایتی استحقاق۔ اسی لئے حکمران طبقات ابھی تک اپنی جائیدادوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں مگر زیادہ عرصے تک وہ اس کی مدافعت نہ کر سکیں گے کیونکہ اس طرح وہ کسی قسم کا مثبت کردار ادا نہیں کر سکتے۔

انسانی تاریخ: ایک نئے موڑ پر

پچھلے بیس سال تبدیلی یعنی غیر متعین، ذومعنی اور غیر یقینی صورتحال میں گزرے۔ سوویت یونین کے انہدام، انفارمیشن ٹیکنالوجی میں انقلاب اور گلوبلائزیشن: ان سب کے یکجا ہونے پر سرمایہ دارانہ نظریات کی حامل مخالف قوتوں نے وقت سے پہلے ہی 'منڈی کی معیشت یعنی مارکیٹ اکانومی' کی فتح کا جشن منانا شروع کر دیا۔ ان کے اس اطمینان اور آسودہ خاطری میں محنت کش طبقہ کی طرف سے کسی قسم کے مربوط چیلنج نہ ہونے سے مزید اضافہ ہوا جس کا اظہار نظریاتی طور پر صنعتی میدان میں ہوتا رہا تھا۔ اس صورتحال کی وجہ ایک طرف صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے محنت کشوں میں پرولتاری سوچ اور حقوق کے تحفظ کے لئے لڑائی کی زوال پذیری تھا تو دوسری طرف نئے ابھرتے صنعتی ممالک کے وہ مزدور تھے جو نظریاتی لحاظ سے ناپختہ اور نابالغ تھے۔

یہ 20 سال تک سرمایہ داری نظام کے ابھرتے بحران میں ایک غیر متوقع وقفہ تھا۔ 1989ء تک مارکسسٹوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہا کہ "طبقاتی جدوجہد میں بڑھتی ہوئی پولرائزیشن، ساتھ ہی نوآبادیاتی دنیا میں بڑھتا ہوا بحران اور مسخ شدہ سوشلسٹ ریاستوں میں مزدور جمہوریت کی ایک بڑی عوامی تحریک سے عوامی ابھار

سامنے آئے گا اور مستقبل قریب میں جگہ جگہ انقلابی جدوجہد سر اٹھائے گی"۔ اس عمومی تناظر کی طرف جانے والا راستہ اچانک بند ہو گیا کیونکہ ساتھ ہی مسخ شدہ سوشلسٹ ریاستوں میں اچانک سرمایہ داری نظام کو فروغ ملا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ترقی کے عروج کی وجہ سے سرمایہ داری نظام نے حیاتِ نو حاصل کی جبکہ سوشلزم کی عمومی اپیل اور کشش اچانک کمزوری اور ناتوانی سے دوچار ہو گئی۔

تاخیر سے آنے والے مالیاتی بحران کے ظہور پذیر ہونے کی تاریخی اہم کمزوری سے انکار کیا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت سارے جواز جھٹلا رہی ہے۔ سرمایہ داری کی سوشلسٹ تنقید ایک دفعہ پھر درست ثابت ہو رہی ہے۔

تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے جس کے بارے مارکس اور اینگلز نے تنبیہ کی تھی کہ معاشرہ ایک ایسے چوراہے پر کھڑا ہے جہاں اپنانے کے لئے ایک طرف سوشلزم ہے تو دوسری طرف خون خوار بربریت جیسے ٹراٹسکی نے اس دور کو سرمایہ داری کی مرتے وقت نزاعی تکلیف سے مشابہت دی تھی۔ یہ دور بہت اہمیت کا حامل ہے۔ صرف بیس سال قبل "سوشلزم کے بھوت" کا مذاق اڑایا جا رہا تھا کیونکہ وہ ریاستیں مسمار ہو چکی تھیں جنہوں نے سوشلسٹ نظامِ معیشت کی بنیاد پر پلاننگ کا دعویٰ کیا تھا اور سرمایہ دار ممالک میں لیبر اور سوشلسٹ پارٹیاں اپنے حقیقی سوشلسٹ پروگرام سے روگردانی کر چکی تھیں۔ یہ پارٹیاں کئی دہائیاں قبل محنت کشوں کے مقاصد کی چیمپئن ہونے کے حوالے سے معرضِ وجود میں آئی تھیں۔ ایک فیشن ایبل فلاسفر نے بھی تاریخ کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا، لبرل سرمایہ داری کی حتمی فتح کی صورت میں۔

اب امریکی ہفت روزہ 'نیوز ویک' اعلان کرتا ہے کہ 'ہم سب سوشلسٹ ہیں' کیونکہ بے مہار قسم کی سٹہ بازی بین الاقوامی سطح پر جنگ جیسی تباہی کا باعث بن گئی جس کے ساتھ بے مثال ذاتی لالچ کے لئے رنگ رلیاں منائی جاتی رہیں۔ یہ سب اپنی ہی ذات میں محو ہونے کی ایک ایسی مثال ہے جسے دیکھ کر اٹلی کے نشاۃ ثانیہ والے عہد کی بورژوازی کو بھی شرم آ جائے۔

60 سال کی خاموشی کے بعد عالمی سرمایہ داری نظام کو، جس کے بڑے مراکز مغربی یورپ اور امریکہ ہیں، 1930 کے عالمی معاشی بحران کے بعد بدترین حالات کا سامنا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے مبلغین چند مہینوں کے اندر اس بحران کو پہلے قرضوں کی بری حالت قرار دیتے تھے پھر اسے کساد بازاری قرار دینے لگے اور پھر کہنے لگے کہ یہ ایک معاشی ڈیپریشن ہے جس کا موازنہ 1930ء کے بحران سے کیا جا سکتا ہے۔ اب کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک صدی کے دوران سب سے زیادہ بڑا بحران ہے جو 10 سے 15 سال جاری رہ سکتا ہے۔ برطانیہ میں بے روزگاروں کی تعداد 40 لاکھ تک پہنچ چکی ہے اور 2 مئی میں 146 [illegible] یہ صورتحال تاریخی طور پر ایک خوشحال آبادی کے دیوالیہ پن اور عالمی فاقہ کشی کا اشارہ دے رہی ہے۔ اس میں کئی نئی جنگوں کا آغاز ہو سکتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ،

پاک و ہند برصغیر کے اندر اور یورپ بھی اب امکانی جنگوں سے دور نہیں ہے۔

بڑے دھارے (Main Stream) کے تبصرہ نگاروں کے لئے یہ بحران ایک جھٹکا ثابت ہوا۔ تاہم ایسا نہیں کہ اس کا اندازہ ہی نہ کیا گیا تھا۔ نہ صرف مارکسی نقطہ نظر کے معیشت دان کئی دہائیوں سے اس صورتحال کی پیش گوئی کر رہے تھے بلکہ دوسری طرح سوچنے والی ایک اقلیت نے بھی (مارکسی سوچ کے برعکس سرمایہ دارانہ) ایسے حالات کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مثال کے طور پر معیشت دان ہیری شٹ (Harry Shutt) نے دس سال پہلے لکھا ''ایک گہرا ہوتا ہوا بحران آ رہا ہے جس کا نتیجہ سماجی طور پر بڑی تباہی کی طرح ہوگا اور وسیع پیمانے پر مکمل بربادی کی شکل اختیار کر سکتا۔ ایسی تباہی مغربی تہذیبوں کی طرف سے پانچ سال میں نشانہ بنانے کے بعد حاصل ہونے والی سماجی خوشحالی اور فراوانی کو ختم کر سکتی ہے۔ یہ ممالک اس ''زمانہ تاریک'' میں جا سکتے ہیں جس کا اظہار ونسٹن چرچل نے 1940ء میں نازی فوج کی جیت کی صورت میں کیا تھا''۔ اگر مزدور طبقہ سرمایہ داری نظام کو ختم نہیں کرتا تو پھر ونسٹن چرچل کی یہ مختصراتی پیش گوئی بہت ہی کمزور اور نرم محسوس ہوگی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد آرام کے وقفے کا اختتام

دوسری عالمی جنگ کے بعد 1950ء اور 1960ء کی سماجی تیزی کے نتیجہ میں عالمی تجارت میں عظیم وسعت پذیری ہوئی اور سابقہ نوآبادیاتی دنیا کے وسائل کو خوب کام میں لایا گیا۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں مزدوروں کی کمی کے نتیجے میں ٹریڈ یونین کی طاقت میں اضافہ ہوا جس کی وجہ سے مزدور اپنے لئے بے مثال معیار زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سب کچھ مخصوص حالات کے تحت عارضی طور پر وقوع پذیر ہوا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ترقی یافتہ ممالک میں آرام اور چین کا وقفہ کافی اور پیداوار کے لحاظ سے فراوانی والا تھا لیکن چھ دہائیوں کے بعد آخرکار ترقی اور فراوانی کی یہ صورتحال ایک مقام پر آ کر رک گئی ہے۔ 1945ء سے 1975ء کے عرصہ میں نوآبادیاتی انقلاب نے دنیا کو تبدیل کر دیا۔ چین، کیوبا، ایشیا اور افریقہ کے کچھ حصوں میں فاتح گوریلا لیڈروں اور باغی جونیئر ملٹری افسران نے سرمایہ داری نظام کو جھٹکے دیے اور سوویت یونین میں مسخ شدہ سوشلسٹ ریاست کی طرز کی ریاستوں کا قیام عمل میں لائے۔ یہ عمل 1970ء کی دہائی کے وسط میں ویتنام کی کسانوں پر مشتمل فوج کے ہاتھوں امریکہ کی شکست کی صورت میں اپنے عروج کو پہنچا۔ اسی دوران پرتگال شہنشاہیت افریقہ میں مسمار ہو گئی اور سابقہ نوآبادیاتی حکومتیں جن میں کیوبا، ایتھوپیا اور انگولا وغیرہ شامل تھیں انہوں نے جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف سخت اقدامات اٹھائے۔ عالمی جنگ کے بعد کا عالمی سرمایہ داری نظام 1970ء کی دہائی آتے آتے سیاسی اور سماجی طور پر بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگ گیا تھا۔

1968ء میں ویتنام کی جنگ کے خلاف احتجاج، امریکہ میں سیاہ فام کے اقلیتی علاقوں میں شورش،

فرانس میں انقلابی صورتحال، انقلاب سے پہلے کی اٹلی کے اندر بے چینی، میکسیکو کی گلیوں میں احتجاج اور بہت سے دوسرے واقعات عالمی جنگ کے بعد کے سیاسی استحکام کے خاتمہ کے پیش رو ثابت ہوئے۔ ویتنام میں امریکہ کی لمبے عرصہ تک رہنے والی جنگ اور 1945ء کے بعد اور نوآبادیاتی علاقوں کے لوگوں کی عالمی سطح پر شورشوں کے نتیجہ میں امریکی فوج کے 58ہزار فوجی ہلاک ہوئے جس کی وجہ سے فوج کے اندر بغاوت ہونے لگی اور ملک کے اندر ذلت اٹھانے پر ختم ہوئی۔ اس طرح ڈالر کی حیثیت بھی کم ہوئی جو عالمی جنگ شروع ہونے کے نتیجے میں سپریم ہو گیا تھا۔ بریٹن ووڈ معاہدے سے مکر جانے کی وجہ سے 25 سالہ سماجی استحکام ختم ہو گیا۔ اس واقعے سے کینیشین حکمت عملی جس کے ذریعے سرمایہ داری نظام وقفہ وقفہ کے بعد بحرانوں کی شدت کو کم کرتا تھا، کی مسماری کے آثار پیدا کر دیئے۔ آسمان سے چھوتا افراط زر ترقی یافتہ دنیا کے قابو سے باہر ہو گیا۔ پھر 1970ء کی دہائی کے وسط میں پرتگال، سپین اور یونان میں آمریت کے زوال نے یورپ میں بڑھتے ہوئے سیاسی عدم استحکام کی تصدیق کر دی۔ 1970ء کی دہائی کے وسط میں ہی تیل کی قیمتوں میں چار گنا اضافے نے عالمی کساد بازاری کی نوید دی۔ طبقاتی قوتوں کے درمیان توازن طاقت اس قدر بگڑ گیا کہ سرمایہ داری کے حوصلے پست ہو گئے۔ فرانس میں جہاں صرف تیس لاکھ مزدور منظم تھے وہاں مزدور ایک کروڑ کی تعداد میں منظم ہو گئے جنہوں نے اپنی کام کرنے کی جگہوں پر سرخ جھنڈے لگا دیئے تھے جبکہ صدر مملکت ڈیگال ملک سے بھاگ گیا، ناکامی سے دوچار یہ کہتے ہوئے بھاگا کہ ''مکمل ختم ہو چکا ہے''۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد پرتگال میں بینک ورکروں نے قبضہ کر کے بینکوں کو زیر دستی قومی ملکیت قرار دے دیا۔ دی ٹائمز نے خاموشی سے اعلان کر دیا کہ پرتگال میں سرمایہ داری نظام ختم ہو چکا ہے۔ تقریباً اسی زمانہ میں مغربی جرمنی کے چانسلر نے افسردگی یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ سارے یورپ میں آئندہ دس سال میں کمیونزم یا فاشزم کا راج ہوگا۔

ویتنام میں شکست کے بعد امریکہ نے آنے والی دو دہائیوں تک سمندر پار کسی قسم کی بڑے پیمانے پر مداخلت سے گریز کیا بلکہ اس نے سی آئی اے کے ذریعے مختلف حکومتوں کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کا پروگرام شروع کر دیا جن سے اس کے مفادات کو خطرہ تھا مثلاً چلی میں ''آلاندے'' کی حکومت یا نکاراگوا میں ''سینڈے نیستا'' کی حکومت۔ سوویت یونین زوال کے بعد امریکی سامراج نے افغانستان اور عراق پر فوج کشی کر کے اپنی فوجی طاقت کی دھاک جمانے کی کوشش کی کیونکہ مجموعی طور پر امریکہ کا سابقہ نوآبادیاتی علاقوں پر سماجی اثر ختم ہو رہا تھا۔ جنگی صلاحیت کی برتری کے باوجود افغانستان اور عراق میں اپنے مقاصد حاصل کرنے سے معذوری چونکا دینے والی حقیقت ہے جو مختلف طاقتوں کے درمیان بدلے ہوئے توازن کی غماز ہے بلکہ اس سے مزید واضح یہ ہے کہ امریکہ اپنے بیک یارڈ یعنی لاطینی امریکہ میں اپنی مرضی مسلط کرنے سے قاصر ہے۔ 1989ء، 1990-91ء میں

سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں زوال نے سرمایہ داری کی زندگی بڑھا دی تھی۔ ریاستی سطح کی منصوبہ بندی نے سابقہ سوشلسٹ ممالک میں غیر معمولی ترقی کی بنیاد رکھی لیکن جیسے ہی معیشت نے اعلیٰ اور پیچیدہ شکل اختیار کی، بیوروکریسی متبادل ترقی کے عمل پر بریک کا کام کرنے لگی اور ترقی کی راہ میں مستقل رکاوٹ بن گئی۔ 1956ء میں ہنگری، 1968ء میں چیکوسلواکیہ اور 1970ء میں پولینڈ میں مزدوروں نے بغاوت سے نوکر شاہی کی جانب سے وسائل کا ضیاع، رشوت اور انتظامی نا اہلی کو بے نقاب کر دیا۔ محنت کش طبقہ حکومت کا تختہ الٹ کر اس کے ہاتھوں سے ریاست کا اختیار چھین کر اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ بہر حال 1980ء کی دہائی تک نوکر شاہی میں ضرورت سے زیادہ سختی اور داخلی طور پر ترقی کے عمل میں ٹھہراؤ، مغرب میں ترقی کی طرف بڑھتے اور ہمسایہ ممالک میں بلند معیار زندگی نے مشرقی یورپ کے ملکوں میں سرمایہ داری نظام کے حوالے سے نئے خیالات جنم لینے لگے۔ قومی ملکیت میں لی گئی معیشتوں کے بڑے بڑے حصوں کو پرائیویٹائز کر کے نوکر شاہی کی لوٹ مار کے لئے نجی ملکیت میں دے دیئے گئے۔ اس نوکر شاہی نے اپنے آپ کو سرمایہ دار طبقے میں بدل لیا۔ نئی منڈیاں کھولی گئیں اور مشرقی بلاک یورپین یونین میں شامل ہو گیا۔ سستے مزدور جو مشرقی یورپ سے مغرب میں آئے تھے ان کی وجہ سے منافعوں میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ سرمایہ داری نظام بے لگام نظر آ رہا تھا اور مستقبل ہو قہقہہ کیلئے آوازوں کے ترنم میں ایک "صبح نو" نظر آ رہی تھی۔

معاشی بحران

آج 2010ء کے آغاز میں سرمایہ داری نظام اپنی 300 سالہ تاریخ کے ایک بڑے بحران کا شکار ہے۔ سرمایہ داری کے گڑھ امریکہ سے شروع ہونے والا مالیاتی بحران اب دیگر شعبوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ صنعت، تجارت اور زراعت کی قیمت پر مالیاتی سرمائے کا پھیلاؤ تھا۔ امریکہ میں 1950ء سے 2005ء تک مینوفیکچرنگ کا کل داخلی آمدنی (GDP) کے 29 فیصد سے کم ہو کر 12 فیصد رہ گئی۔ لینن نے اپنی تاریخی کتاب "سامراج، سرمایہ داری کی آخری منزل" میں اس بارے یوں لکھا "عمومی طور پر سرمایہ داری کی یہ خصوصیت ہے کہ سرمایہ کی ملکیت سرمایہ کے لیے پیداوار کے استعمال سے علیحدہ ہوتی ہے اور سرمایہ صنعتی یا پیداواری سرمایہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے"۔

اس بحران کے بارے میں آئی ایم ایف نے اپریل 2009ء میں اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی مرتبہ عالمی پیداوار میں گراوٹ نظر آئے گی۔ جبکہ ورلڈ بینک نے کہا ہے کہ 80 برسوں کے مقابلے میں عالمی تجارت سب سے زیادہ تیزی سے سکڑ رہی ہے۔

امریکہ کے ادارہ کا نوسٹ کے مطابق دسمبر 2007ء سے اپریل 2009ء تک امریکہ میں 40 لاکھ 40 ہزار افراد بے

روزگار ہو گئے ہیں۔ برطانیہ میں اس سال مارچ تک 20 لاکھ افراد بے روزگار ہو چکے ہیں۔ جاپان میں بے روزگار ہونے والے ایک لاکھ ساٹھ ہزار جاپانی محنت کشوں کی اکثریت اپنے گھروں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ یہی صورتحال امریکہ کی بھی ہے۔ چین میں برآمدات کی کمی کی وجہ سے 2 کروڑ مزدور بے روزگار ہوئے۔ آئرلینڈ میں بے روزگاری پچھلے سال کی نسبت دوگنا ہوئی۔ امریکی منڈی میں تین امریکی کار کمپنیوں کا 2000ء میں جو حصہ 65 فیصد تھا، 2008ء میں کم ہو کر 46.5 فیصد رہ گیا ہے۔ امریکی موٹر ساز کمپنیوں میں محنت کشوں کی تعداد 11 لاکھ 60 ہزار سے کم ہو کر سات لاکھ 32 ہزار رہ گئی۔

☆ بحران کی ایک شکل تیسری دنیا کے ممالک پر قرضہ جات میں اضافہ اور ترقیاتی امداد میں مسلسل کمی ہے۔ 1970ء میں تیسری دنیا کے ممالک صرف 170 ارب ڈالر کے مقروض تھے۔ 2006ء میں یہ بڑھ کر 2800 ڈالر ہو گئے۔ شمال کے ممالک ساؤتھ کے ممالک کو 1980ء سے 2005ء تک 5800 ارب ڈالر قرضہ جات کی مد میں ادا کر چکے ہیں۔

☆ IMF کے چیف Strass Kahn نے کہا کہ دنیا اب ایک عظیم زوال پذیری (Great Recession) کا شکار ہے اور 2009ء میں دنیا کی ترقی کی شرح زیرو رہے گی۔ بھارت میں سٹاک ایکسچینج 21 ہزار پوائنٹ سے نیچے آ کر 10 ہزار تک آ گئی ہے۔ پاکستان میں یہ 15 ہزار سے واپسی کا راستہ اختیار کر کے 5 اور 6 ہزار کے درمیان ہوئی ہے۔ ٹیکسٹائل کے دس لاکھ مزدور تو پہلے ہی نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں جبکہ جیولری انڈسٹری، ڈائمنڈ کٹنگ اور گولڈ میں کام کرنے والے مزید 10 لاکھ افراد فارغ ہو چکے ہیں۔ کئی لاکھ تعمیراتی مزدور بھی بے روزگار ہو گئے ہیں۔

سرمایہ دار معیشت دان موجودہ عالمی سرمایہ دارانہ بحران کو فنانشل سیکٹر میں مسائل قرار دیتے ہیں اور یہ دلیل دیتے ہیں "حقیقی معیشت مضبوط ہے معیشت کے بنیادی ستون اچھی حالت میں ہیں"۔ اس سے زیادہ دھوکہ دہی اور نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی تھوڑے عرصے کا چھوٹا بحرانی دورانیہ نہیں ہے۔ یہ ان کی معیشت کا سٹرکچرل بحران ہے۔ خاص طور پر 2000ء کے بعد سے امریکہ، یورپ اور جاپان میں مسلسل گرتے ہوئے مجموعی کل داخلی پیداوار (GDP)، انوسٹمنٹ اور حقیقی تنخواہوں میں اس بحران کی جڑیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

جعلی سرمائے کا دھماکہ، ورلڈ اکانومی کی فنانشلائزیشن، بڑے قرضہ جات سسٹم کو ایک خاص حد تک نظام کی حدود کو آگے دھکیل سکتے تھے یا کسی حد تک اسے ملتوی کر سکتے تھے۔ مگر جلد یا بدیر اسے بڑے تضادات نے اسے بحرانی کیفیت تک لانا ہی تھا۔

پچھلے پندرہ سالوں میں چھ بحران سامنے آئے۔ 1994ء میں میکسیکو کا بحران، 1997ء میں ایشیائی بحران، 1998ء میں روسی بحران، 2001ء میں ارجنٹینا کا بحران، 2001ء کا ہی انٹرنیٹ غبارہ بحران اور 2007ء کا بڑا معاشی

بحران، موجودہ بحران سب سے اہم ہے کیونکہ یہ سرمایہ داری دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے اندر برپا ہو رہا ہے اسکے کناروں پر نہیں۔

1960ء کے بعد ہی سرمایہ داری دنیا کا حقیقی شرح منافع مسلسل کم ہوتا رہا۔ ایک کے بعد دوسری مینوفیکچر طاقت ورلڈ مارکیٹ میں داخل ہوتی رہی۔ جرمنی کے بعد جاپان، نارتھ ایسٹ کے ممالک، ساؤتھ ایسٹ ایشین ٹائیگرز، بعد ازاں چین ورلڈ مارکیٹ میں داخل ہونے والی آخری طاقتوں نے وہی چیز پیدا کیں جو اس سے پہلے دیگر بڑے صنعتی ممالک میں بن رہی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ انہوں نے یہ چیزیں بہت زیادہ تعداد میں اور سستی بنا دیں جس سے ان اشیاء کی قیمتوں میں مسلسل کمی ہوتی رہی۔ جس سے پوری ورلڈ مارکیٹ میں ترقی کم ہوتی رہی اور نوکریاں بھی۔ اپنے منافعوں کو قائم رکھنے کی کوشش میں مزدوروں کی تنخواہوں کو حقیقی معنوں میں نہ بڑھایا گیا اور حکومتوں نے سماجی اخراجات میں کمی شروع کر دی۔

حقیقی تنخواہوں میں ایک اہم گراوٹ دیکھنے میں آئی اور تنخواہوں کا دولت کی پیداوار میں حصہ بھی مسلسل کم ہوتا رہا۔ 1980ء سے 2006 تک صنعتی ممالک میں دولت کی پروڈکشن میں تنخواہوں کا حصہ 67فیصد سے کم ہو کر 57فیصد رہ گیا۔ ILO کے مطابق کل داخلی پیداوار میں یہ دوبارہ انویسٹ نہیں ہوئے وہ وہاں گئے جہاں منافع زیادہ تھا یعنی فنانشل مارکیٹیں، اس کا منطقی نتیجہ انویسٹمنٹ میں کمی تھا۔ 2005ء میں امریکہ، یورپ اور جاپان میں منافع 5.5 فیصد بڑھا جب کہ انویسٹمنٹ 2فیصد رہی۔ اسی سال امریکہ میں فنانشل انویسٹمنٹ 21فیصد بڑھی، جبکہ اس سیکٹر میں منافع 150فیصد بڑھ گیا۔ 2006ء میں ورلڈ GDP 45000 بلین ڈالر تک پہنچی، جبکہ ڈیریویٹیوز 621 کھرب ڈالر تک جا پہنچیں۔

تنخواہوں اور منافع، اور منافع اور انویسٹمنٹ میں فرق بعد ازاں فنانشل دھماکے کی صورت میں نظر آیا۔ امریکہ میں عوامی قرضوں سے اس فرق کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1975ء میں گھریلو قرضہ جات 62فیصد تھے جبکہ 2007ء میں یہ 127فیصد تک بڑھ گئے تھے۔

موجودہ بحران میں ایک اہم کردار پراپرٹی کی بڑھتی ہوئی قیمتیں تھیں۔ 2000ء کے بعد ان کی قیمتوں میں 7.6 فیصد اور 2005 سے 2006 میں قیمتوں میں 11فیصد تک اوسط اضافہ ہوا۔ پراپرٹی شعبہ میں سرمایہ کاری 13ہزار ارب ڈالر تک جا پہنچی۔ 2007ء کے وسط تک جب ہاؤسنگ شعبہ میں زوال کے آثار سامنے آئے تو 2008ء میں اس شعبہ میں سرمایہ کاری 13ہزار ارب سے کم ہو کر 8.8ہزار ارب ڈالر تک رہ گئی۔

اس بحران کے دوران سٹاک ایکسچینج کا ابھار مسلسل زوال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ 2008ء کے آخر تک پوری دنیا میں سٹاک ایکسچینج تقریباً 50فیصد کم ہو گیا تھا اور 25000 ارب ڈالر رہ گیا ہے۔ بینکوں اور سٹاک ایکسچینجوں میں اربوں ڈالر کی ریاستی امداد بھی انہیں گرتے ہوئے رجحانات کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔

بحران کو روکنے میں چین پر انحصار کے دلائل بھی غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ عالمی سرمایہ داری بحران نے چین کی مسلسل ترقی کرتی ہوئی معیشت میں بھی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ 2009ء میں اسکی سالانہ گروتھ اندازہ صرف سات فیصد کیا جا رہا ہے جبکہ پہلے یہ 11فیصد اوسط کے لحاظ سے پچھلے دس سالوں سے ترقی کر رہی تھی۔

1929ء کے بحران کے بعد ریاست کا جواب Protectionist پالیسیوں کی صورت میں تھا۔ جس کا ایک نتیجہ دوسری جنگ عظیم کی صورت میں نکلا۔ اب حکومتیں Protectionist طریقہ کار، نیشنلسٹ اور ملٹری رسٹ طریقہ کار سے بچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ حالیہ جی 20 میں بھی ان ایشوز پر تفصیلی گفتگو ہوئی اور صنعتی ترقی یافتہ ممالک کے حکمرانوں کے درمیان ہوئی ہیں۔ مگر حالات اگر اس سے بھی کنٹرول نہ ہوئے تو یہ حکومتیں انتہائی دائیں بازو کی پالیسیاں اختیار کر سکتی ہیں۔

عالمی سرمایہ داری نظام کے بحران کا اثر چین میں شاید سب سے زیادہ بڑھ کر ہوگا۔ کیونکہ چین کی معیشت زیادہ تر امریکی معیشت کی حالت سے جڑی ہوئی ہے اور اسی پر انحصار کرتی ہے۔ چین میں بنیادی طور پر ترقی اسکی امریکہ کے ساتھ تجارت اور ایکسپورٹ کی وجہ سے ہوئی یہاں پر بحران Over Capacity کا ہو گیا ہے۔ وہ اتنا پروڈیوس کر رہے ہیں جتنا بیچ نہیں سکتے۔ امریکہ و یورپ کی مارکیٹیں چینی اشیاء کے لیے بند ہوتی جا رہی ہیں۔ صرف کنٹون میں 3000 فیکٹریاں بند ہو چکی ہیں۔ چین ایک سرمایہ داری کے تمام طریقے اختیار کر چکا ہے۔

اپریل 2009ء میں جی 20 کے لندن اجلاس میں جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا وہ بنیادی طور پر اپنے سرمایہ داری نظام کو دوبارہ ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔ انہوں نے لبرل ایجنڈا کو جاری رکھنے پر رضامندی کی ہے اور WTO کے فریم ورک میں ورلڈ ٹریڈ اور لبرلائزیشن کو جاری رکھنے پر اتفاق کیا ہے اور آئی ایم ایف کو مضبوط کر دینے پر اتفاق ہوا ہے۔ ایک تو اس کے حصول تباہ شدہ زمین کو دوبارہ چھوڑا سارنگے کا ساجدہ ہوا ہے۔

2009ء میں گلوبل اکانومی 1.3فیصد کے لحاظ سے سکڑنے کا اندازہ کیا جا رہا ہے۔ برطانیہ میں 4فیصد تک کم ہو گئی اور جاپان 6فیصد۔

اس سارے بحران کا حقیقی خمیازہ دنیا بھر کے محنت کش عوام کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ حکومتیں گرتی ہوئی بڑی کمپنیوں کے اخراجات کو خود ادا کر رہی ہیں جبکہ منافع کو پرائیویٹائز کیا جا رہا ہے جبکہ کروڑوں محنت کش عوام کو بڑے پیمانے پر غربت، بیروزگاری، کم تنخواہوں، زیادہ ٹیکسوں کا سامنا ہے۔

ستمبر 2007ء سے جاری یہ بحران اب تیزی سے اکانومی کے تمام پہلوؤں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اس دوران بینکوں اور دیگر فنانشل اداروں نے 30فیصد نقصانات کو Write off کر دیا۔ یورپ اور امریکہ کے 15 بڑے کمرشل اور انویسٹمنٹ بینکوں کے جون 2007ء میں مارکیٹ ویلیو کا 1726 ارب ڈالر موجود تھا۔ 20 اکتوبر 2008 کو یہ گر کر 901 ارب ڈالر رہ گیا۔ امریکی بینکوں کا منافع 35.2 ارب ڈالر گر کر 5.8 ارب ڈالر رہ گیا۔

بحران کی وجہ سے بڑھتی ہوئی بے روزگاری کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ امریکہ میں ہر ماہ جون 2009 تک 10 لاکھ افراد بے روزگار ہونے کا خدشہ ظاہر کیا جارہا ہے۔ 1930ء کے بعد پہلی دفعہ سرمایہ داری کی حقیقی اکانی کے نیچے گرنے کی پیشین گوئی 2009ء کے دوران کی جا رہی ہے۔

بحران سے ڈیل کرنے کے لیے کینیشیزم، خسارے کی سرمایہ کاری اور فرینکلن روزویلٹ کی 1930ء کی دہائی میں نیو ڈیل جیسے خیالات یاد کیے جارہے ہیں۔ لیکن اس قسم کے خیالات کے عملی اطلاق کی صورتحال نظر نہیں آرہی۔ زیادہ تر حکمران طبقہ نیولبرل پالیسیوں سے ہی چپکا نظر آرہا ہے اور ڈی ریگولیٹ کو ری ریگولیٹ کرنے کا امکان کم ہی نظر آرہا ہے۔ یہ درست ہے کہ نیو ڈیل اور کینیشیزم کے طریقہ کار سے امریکہ اور یورپ میں طبقاتی جدوجہد وقتی طور پر دب گئی تھی۔ لیکن اسی عرصہ یعنی 1930ء کی دہائی میں سرمایہ داری بحران سے نکلنے کے لیے دوسری جنگ عظیم کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ لہٰذا ایک بڑی بڑا سوشل منزل کے علاوہ کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

اگرچہ اس صورتحال کے لیبر موومنٹ پر اثرات کا جائزہ لینا تھوڑا قبل از وقت ہے مگر سرمایہ دار طبقہ ایک سیاسی و نظریاتی شکست سے دوچار ہوا ہے جس کی وجہ سے اپنی نیولبرل اور اپنی سرمایہ دارانہ خیالات کو ایک نئی جگہ ملی ہے۔ مزدور طبقہ ترقی یافتہ ممالک میں جدوجہد کے ایک نئے زینے قدم رکھ چکا ہے۔ فرانس، یونان اور سپین میں ہڑتالیں، G20 کے خلاف مظاہرے اور مئی ڈے 2009ء پر یورپ بھر میں پہلے سے کہیں مزدور طبقے کے موجودہ معیار کو برقرار رکھنا اور اس کا دفاع کرنا ایک اہم جدوجہد بن کر سامنے آرہا ہے۔ عالمی سطح پر سوشل جسٹس موومنٹ پر بھی اس بحران کے اثرات ہوں گے ان میں موجود کچھ رجحانات زیادہ ریڈیکل ہو کر سرمایہ داری سے علیحدگی کی طرف جائیں گے۔ کچھ دیگر "حقیقت پسندانہ حل" تجویز کریں گے۔

صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں نئی تیاریاں کرنی ہوں گی۔ نیولبرل پالیسیاں مکمل ناکامی سے دوچار ہو رہی ہیں یہ نہ صرف دنیا بلکہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ دو بڑے سوال اب سامنے آئیں گے، دولت کی منصفانہ از سر نو تقسیم اور ملکیت۔ بڑے بینکوں اور کمپنیوں کے لیے گھنٹوں میں ہی اربوں ڈالر کے بیل آؤٹ پروگرام اختیار کیے گئے مگر تنخواہ دار کے لیے ان کے خزانے ہمیشہ خالی ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ پچھلے 25 سالوں میں دولت کی تقسیم کے جو منصفانہ طریقہ کار خاص طور پر اختیار کیے گئے ہیں ان کو ایک بیک گیئر لگایا جائے۔ ہمیں پبلک اور سوشل مداخلت کی ضرورت ہے پبلک اونرشپ اور نیشنلائزیشن کو دوبارہ بھرپور انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارا نقطہ آغاز نوکریوں کا تحفظ، چھانٹیوں کے خلاف پبلک سیکٹر کو مضبوط کرنا، نجکاری کی مخالفت، اور تنخواہوں میں اضافے کے مطالبات ہونا چاہیے۔ یہ مزدور اور عوام نہیں جنہیں اس بحران کی قیمت ادا کرنی چاہیے یہ سرمایہ دار طبقہ ہے "عوام کو بچائیں نہ کہ کمپنیوں" کو ہمارا نعرہ ہونا چاہیے، محنت کش عوام کے معیار زندگی کو بڑھانا انہیں مضبوط کرنا، ان کا دفاع کرنا، اور ٹھوس مطالبات کے پر اتحاد کی بنیاد پر عوام کو موبلائز کرنا لیبر موومنٹ اور سوشل موومنٹ کا بنیادی

خاصہ ہونا چاہیے۔ ہم سرمائے کی پرائیویٹ اونرشپ کو معیشت کے سوشلائز کرنے اور اسے مزدوروں کی منتخب کمیٹیوں کے کنٹرول میں کرنے کی بات کرتے ہیں۔ سرمایہ داری عوام کا موجودہ بحران فوری ختم ہونے والا نہیں، نہ ہی فوری مستقبل میں اسکے ختم ہونے کے امکانات نظر آتے ہیں یہ ایک کے بعد دوسری معیشت کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ مگر جس طرح لینن نے کہا "سرمایہ داری کا کوئی فائنل بحران نہیں ہوتا" اگر محنت کش طبقہ ان کے نظام کو ختم کر کے ایک سوشلسٹ سماج قائم نہیں کرتا۔

بحران کی مزید تفصیلات

اگرچہ دوسری عالمی جنگ کے بعد سرمایہ دار ممالک میں معاشی ابھار رہا مگر قلیل مدت کی کساد بازاری بھی دیکھنے میں آئی۔ 75-1974ء میں مجموعی طور پر ترقی یافتہ ممالک ایک قسم کے معاشی استحکام سے بہرہ ور ہوئے حتیٰ کہ پچھلے بیس سال سے بڑی کساد بازاری سے بچا گیا جس کی وجہ جنگی ہتھیاروں پر آنے والا بہت بڑا خرچ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ارتقائی انقلاب ہے۔ مختلف النوع سٹہ بازی میں دستاویز کی صورت لگائی جانے والی رقوم بھی اس کی وجہ بن گئیں۔ سرمایہ داری نظام اتنے عرصہ تک ہی مرکزیت کے قانون کو دھوکہ دے سکتا تھا بہرحال اب یہ اس کی قیمت میں ادا کر رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ معاشی پھیلاؤ جو مندی کے بحران کے بعد نظر آیا کی وجہ وسیع پیداوار تھی جو مسخ شدہ سوشلسٹ ممالک کی منڈیاں کھولنے کی وجہ سے ممکن ہوئی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اعلیٰ تکنیکی ترقی کی وجہ سے بھی۔ بہرحال اس گرم بازاری میں مرکزی قوت وسیع تر بنیادوں پر قرض کی فراہمی تھا۔ فنانشل کریڈٹ کا انڈسٹریل کریڈٹ پر غلبہ ہو گیا۔ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صنعتی پیداوار 1950ء میں جی ڈی پی کا 29 فیصد تھی یہ کم ہو کر 2005ء میں 12 فیصد پر آگئی۔ اس عرصہ میں فنانشل سروس 10 فیصد سے بڑھ کر 50 فیصد ہو گئے۔

2000ء کے لگ بھگ ترقی کرتی ہوئی ایشیائی معیشتوں سے دولت اور وہ کھربوں ڈالر جو چین سے آبشار کی طرح امریکی بینکوں میں جمع ہیں انہوں نے سٹہ بازی کے غبارے میں ہوا بھرنے کا عمل تیز کیا۔ سرمایہ بیش منافع بخش سرمایہ کاری کی طرف جاتا ہے لہٰذا شیئر پرائس کی بڑھتی ہوئی قیمتیں، کرنسی کی سٹہ بازی، پرائیویٹائزیشن سکیمیں، ڈاٹ کام کمپنیاں، پراپرٹی مارکیٹ نے دوسرے بڑے عوامل کے طور پر کام کیا۔ امریکی ہاؤس آف پرائمر میں 60 سال تک نہ دکھنے والی گرم بازاری نقصان اور سکہ میں تبدیل نہ ہونے والے قرضوں پر زور دیا گیا۔ پھر ان قرضوں کو دوبارہ پیکج کی صورت میں نسبتاً قابل ادائیگی قرضوں کے ساتھ ملا کر ثانوی حیثیت کے قرضوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ منافعوں کو پھر غیر واضح سٹہ بازی میں لگا دیا گیا۔ اس طرح بے ترتیب اور بے قابو منافع خوری بین الاقوامی اہرام کی صورت میں پھیل گئی جب فرضی زر دوبارہ بڑھنے لگا۔ یہ دوسرے عوامل کے علاوہ تیل کی

قیمتوں میں اضافے کی وجہ تھا (چین کی اقتصادی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی ہے) تو تمام کھیل کھل کر سامنے آنے لگا۔ سود کی شرح میں اضافہ ہوا جس کے بعد رہن کے بدلے قرضے ڈیفالٹ کرنے لگے، فاضل جائیدادوں کی قیمت منجمد ہو کر ایک ہی نقطے پر گلنے سڑنے لگی۔ انٹر بینک ریٹ قرض دینے کے حوالے سے اچانک منجمد ہو گئے جس کے بعد قرضوں میں توڑ مروڑ شروع ہو گئی جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ اس سارے عمل میں اختراعی دستاویزات کا بے تحاشا استعمال تھا۔ اس قسم کی سٹہ بازی بریٹن ووڈ معاہدے کے زوال کے بعد بہت بڑھ گئی۔ کسی عالمی سطح کی مستحکم کرنسی کی فقدان ہونے کی وجہ سے مختلف کرنسیوں کی قدر میں تبدیلی کی وجہ سے کرنسیوں کی سٹہ بازی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ کرنسی کی سٹہ بازی کی یہ صورت ہو گئی جیسے کرنسی ایک جنس کی صورت اختیار کر گئی ہو۔ نفاذ کردہ دستاویزات پر سود ریٹ میں اتار چڑھاؤ پر سٹہ بازی شروع ہو گئی (جب امریکہ کے مرکزی بینک نے اس چیز کو سب سے بڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا) اشیاء کی قیمت اور سود کے ریٹ پر بھی سٹہ بازی کی گئی۔ کم منافع جات نے فاضل سٹہ بازی میں اور بھی اضافہ کر دیا (یعنی مختلف کرنسیوں کی ویلیو پر جوا یا سٹہ بازی)۔

معاشرے میں تمام مالیاتی سیکٹرز میں بڑھتے ہوئے قرضوں کے زیر بار ہونے سے جنم لینے والا یہ بحران بہرحال اول و آخر امریکی سرمایہ داری نظام کا بحران ہے جو امریکی صنعتی پاور ہاؤس پر منحصر ہونے کی بجائے اپنا غلبہ دنیا کا سب سے بڑا صارف ہونے کی حیثیت سے رکھتا ہے۔ ڈالر کے دنیا کی ریزرو کرنسی ہونے کی وجہ سے یہ بحران عارضی طور پر ٹلا ہوا ہے۔ عنقریب امریکی ڈالر کی ویلیو کا بحران امریکہ کو اس کی فوجی برتری پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیگا لیکن دنیا میں کوئی قوم اپنی فوجی طاقت کی برتری کو ہمیشہ قائم نہیں رکھ سکتی۔ امریکہ اپنے حریفوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کے نیچے دبا جا رہا ہے (مثال کے طور پر چین) امریکہ کی حقیقی بے عزتی اور اس کی واضح ثبوت 11 ستمبر 2001ء کا خوفناک چھاپہ مار حملہ ہے۔ یہ سرکشی تیل پیدا کرنے والی ریاستوں کے شیوخ کی طرف سے جرأت مندانہ تجربے کا کھلا اشارہ ہے یعنی خودکشی حکمت عملی کے طور پر اپنائی گئی۔ یہ اپنے مخالف کے خلاف دوسروں کی طرف سے اپنائے جانے والے قدیم طریقے کی ذرا مختلف شکل ہے۔ افغانستان، عراق اور اسی طرح مزید دوسرے ممالک کے خلاف جنگ تیل اور وسائل پیداوار کی خاطر جنگوں کا پیش خیمہ ہے۔ دم توڑتی ہوئی سپر پاور (امریکہ) اپنی صنعتی طاقت کو زیادہ دیر قائم نہ رکھ سکنے کے پیش نظر اپنی بھاری بھرکم فوجی طاقت کے بل بوتے پر اس برتری کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔

موجودہ معاشی بحران عالمی معیشت کے بڑے سیکٹروں میں بحرانوں کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتا نظر آ رہا ہے۔ سوویت یونین میں رد انقلاب نے معیار زندگی میں خوفناک پستی پیدا کی ہے جو ”بحرانے“ کی حکومت میں چلی میں پیدا ہونے والی صورتحال سے بھی زیادہ بری ہے۔ اوسط عمر کی حد بری طرح کم ہوئی ہے۔ آدھی سے زیادہ

آبادی بے تحاشا غربت کی لکیر سے نیچے آ گئی ہے اور ایک چوتھائی 1930ء کی غربت سے بھی زیادہ ہے۔ موجودہ معاشی بحران جائیدادوں کی بے تحاشا بڑھتی ہوئی قیمتوں پر آئندہ زیادہ منافع ملنے کی امید پر (سٹے بازی) کی خرید و فروخت کی وجہ سے ہے۔ 98-1997ء میں جنوب مشرقی ایشیاء کی ترقی کرتی ہوئی معیشتوں پر سٹے بازی کا زبردست حملہ ہوا جس کے نتیجے میں 600 ارب ڈالر بازار حصص سے نکال لیا گیا۔ یہ عمل واضح وارننگ کے مترادف تھا اس بحران کی وجہ سے برِاعظم کے ممالک دیوالیہ پن کا شکار ہوئے جس میں تھائی لینڈ، آئرلینڈ، ہنگری، یوکرائن، ترکی، جنوبی کوریا اور کئی دوسرے ممالک شامل تھے۔ مشرقی یورپ کے ممالک کے معاشی بحران کا مقابلہ 1998ء کے ایشیائی بحران سے کیا جا سکتا ہے۔ آئی ایم ایف کے موجودہ غیر مستحکم قرضے لٹویا، ہنگری اور یوکرین کے دوسرے ممالک کی جی ڈی پی کے برابر ہیں۔ کچھ کیس ایسے ہیں کہ آئی ایم ایف نے ان ملکوں کے بجٹ میں کٹوتی کرنے کا مطالبہ کیا جس کی مدافعت کی گئی۔ ان ممالک میں سرمایہ داری نظام کی معاشرتی اور سیاسی جڑیں کمزور ہیں۔ ان ممالک میں یقیناً ماضی کی طرف لوٹ جانے کی خواہشیں بڑھ رہی ہوں گی، جہاں مقابلتاً سو فیصد روزگار، کم کرایہ مکان اور سستی اشیاء خورد و نوش مہیا تھیں۔

سرمایہ دار ممالک اس بحران سے نکلنے کیلئے سخت متنازعہ بڑے بڑے اقدامات اٹھا رہے ہیں انہوں نے معاشی بحران پر خوف زدگی سے ردعمل کیا ہے اور وہ مکمل دیانتدارانہ مالیاتی پالیسی کی بجائے ”کینیشین“ خسارے کی فنانسنگ بلکہ مقابلتاً آسانی اپنا رہے ہیں۔ (یعنی Qualitative Easing) ان نرم الفاظ کا اصل مطلب جعلی کرنسی چھاپنا یعنی کرنسی کی ایسی بے قدری جس کے نتیجے میں لازمی طور پر بے تحاشا مہنگائی پیدا ہو جائے گی۔ اب تک موجودہ بیل آؤٹ پروگرام پر تقریباً 23000 بلین پاؤنڈ خرچ ہوئے ہیں اس سلسلہ میں بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور کار انڈسٹری کو جزوی طور پر قومی ملکیت میں لیا جا چکا ہے۔

آج کل کہا جا رہا ہے کہ فنانس کیپیٹل کو کسی نہ کسی صورت باقاعدہ کرنا ضروری ہے لہٰذا یقیناً اس سلسلے میں پابند کرنے والے نئے ریگولیشنز بنائے جائیں گے۔ بہرحال پیداواری اور ڈھیلی ڈھالی نگرانی کی وجہ سے فنانس کیپیٹل کے لئے چنداں مشکل نہ ہوگا کہ وہ ان ریگولیشنز سے بچنے اور انہیں ناکام کرنے کیلئے ایک کے بعد دوسرا طریقہ اختیار کرے۔ یہ غلط فہمی کہ مجوزہ طریقہ کامیاب ہوگا، ناامیدی کی علامت ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ معیشتیں پہلے ہی ڈوبنے والے قرضوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہیں۔ حکومتی خرچ کے حوالے سے کھاتوں کو متوازن بنانے سے محض بہت بڑی بے روزگاری پیدا ہوگی۔ لہٰذا آئندہ ڈیمانڈ ختم ہو جانے سے خسارے کی فنانسنگ سرمایہ داری نظام کی بنیادی کمزوریوں کا علاج نہیں ہے بلکہ خطرہ ہے کہ مستقبل میں آنے والی جلتی پر تیل کا کام کرے گی جبکہ اس عمل کا قطعی رجحان تحفظ دینے اور کرنسی کی قدر میں کمی کرنے کی طرف ہوگا بلکہ یورو کرنسی کے بھی ناکام ہو جانے کا خطرہ ہے۔

آنے والا انقلاب

موجودہ معاشی بحران میں انقلاب اور ردِ انقلاب کا ایجنڈا واپس آئے گا، یہ عرصہ طویل ہوگا۔ اس سے سرمایہ کے سیدھے سادھے جھکاؤ بھی ہوں گے اور واضح طور پر ناکامی اور شکست بھی ہوگی۔ انقلاب برپا کرنے کے لئے محنت کش فوری جدوجہد کی طرف نہیں آئیں گے بلکہ ناامیدی سوچ کا شکار، اصلاحات کے حوالے سے شکوک وشبہات، مذہبی زور خطابت، عوامی حاکمیت، قوم پرستی اور ان سب سے خطرناک نسل پرستی اور غیر ملکیوں سے نفرت جیسے رجحانات وقتی طور پر سامنے آسکتے ہیں لیکن یہ سب کچھ سوشلسٹ نظریات کا منبع بھی ثابت ہوگا جو لینن کے الفاظ کے مطابق "کروڑوں لوگوں کے ذہن کو متاثر کرنے والی موثر طاقت" بھی ہوگی۔ برطانیہ کے ٹوری ممبر میکس ہیسٹنگ اس نتیجہ پر پہنچا کہ "یہ حیرت انگیز ہوگا کہ بائیں بازو کی پکار کو سننے والا کوئی نہ ہوگا" جیسا کہ گذشتہ تیس سال میں ہوا۔ اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ دائیں بازو کی انتہاء پسندی میں اضافہ ہوگا لیکن یہ اس سے بھی حیران کن ہوگا کہ نیا بایاں بازو برطانیہ اور دوسری جمہوریتوں میں اقتدار پر قبضہ کے لئے چیلنج نہیں کریگا۔

اس قسم کے بحران کے حوالے سے دو تین نسلیں گزر چکی ہیں جس نے طبقات کو براہ راست مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ سرمایہ داری کا متبادل فتح اور معقول سوشلسٹ نظام متعارف کرانے میں ناکامی حالات کو بیسویں صدی کے وسط کی طرف ایسے حالات و واقعات کی طرف لے جائے گی جو شاید قرون وسطیٰ نے بھی نہ دیکھے ہوں۔ فاقہ کشی، بے گھری، وسیع البنیاد ہسٹریا کا مرض، خانہ جنگی، نسل کشی، شہروں کی بربادی، کروڑوں افراد کا قتل، اجتماعی قید کے کیمپ، گیس کوٹھری میں بٹھا کر جان لینا، ایٹم بم اور خونریز نسلیں، یہ خوفناک خواب جو ممکن ہے اس دفعہ پوری انسانی سماج کے لئے حتمی تباہی کے گڑھے میں اختتام پذیر ہو۔ اس کو دوبارہ وقوع پذیر ہونے سے روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تباہی کے معاشرے کو وسائل کے معقول انتظام عصر امکی بنیاد پر منظم کیا جائے اور انسان کی پیداواری صلاحیت عمل کو پوری طرح روبہ عمل لایا جائے۔

1930ء کی لڑائیاں تقریباً دو دہائیوں پر مشتمل تحریکوں کی وجہ سے ہوئیں جو کہ اٹلی میں ہونے والی ناکامی کے احساس کے نتیجہ میں تھیں۔ بیشک محنت کش طبقہ منظم، متحرک اور کچھ حالات میں قدرے مسلح بھی تھا۔ انقلاب کے حوالے سے ایک حالیہ مذاکرے میں کہا گیا ہے کہ محنت کش طبقہ پرولتاری تنظیم کا وفادار تھا اور پورا سوشلسٹ شعور رکھتا تھا مگر اس کا ایک انتہائی نقصان دہ پہلو بھی تھا وہ یہ کہ ایسے لیڈروں کے ساتھ غلط وفاداری جو شعوری طور پر اپنے مقصد (محنت کشوں کے مقصد) کے ساتھ بیوفائی کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے اور اس میں نہ صرف اصلاحات پسند اور زرخرید ٹریڈ یونین عہدیدار تھے جنہوں نے طبقات کے درمیان صلاح مشورہ میں اپنے

اصول اور اصولی کردار کو خیرباد کہہ دیا تھا بلکہ سب سے زیادہ سوویت سابقہ یونین بیوروکریسی کے نئے نئے سامنے آنے والے سیاسی ترجمان بھی تھے۔ بیوروکریسی کا یہ حاکم طبقہ اس وجہ سے اقتدار میں آگیا تھا۔ یہ ملک انقلاب سے دور بھی خوفناک زمانہ جاہلیت کی پسماندگی کی دلدل میں تھا۔ مکمل تباہی لانے والی سیاسی غلطیاں تھیں یعنی موقع پرستی اور الٹرالیفٹ مہم جوئی، دونوں ہی بچگانہ بے وفائی اور غداری تھیں۔ یہ ان کی نظریہ کے ساتھ سوچی سمجھی بے وفائی تھی جس نے آخر کار محنت کشوں کو شکست کی تباہی اور ذلت سے دوچار کیا۔ مسخ شدہ سوشلسٹ ریاستوں کی بیوروکریسی کے گرنے نے سوشلسٹوں کو اب طبقات کی حدود یاں چیلنج کا بہترین موقع فراہم کیا ہے۔ ریاستی کنٹرول میں منصوبہ بند معیشت پر قبضہ کے ساتھ خوفناک بدعنوانی اور جبر کرنے کی صلاحیت جس کی حامل یہ نوکر شاہی طویل عرصہ تک رہی، اب دوبارہ نہ کر سکے گی۔

موجودہ بحران محنت کشوں کو ان کے پرانے مراکز میں لے گیا ہے مگر وہ سیاسی طور پر پہلے سے تیار ہیں۔ ان کا پرانا سوشلسٹ نقطۂ نظر بنیادی طبقاتی شعور سے غیر مسلح گہرائیوں میں گم ہو چکا ہے جس کی کئی وجوہات ہیں۔ اس کی فوری وجہ سابقہ سوشلسٹ ریاستوں کا ختم ہونا ہے جو اپنے تمام تر منفی اور برعکس پہلوؤں کے باوجود کسی متبادل مستقبل کے لئے موہوم سی امید رکھتی تھیں۔ دوسری وجوہات میں صنعتی کمیونٹی کا اپنے روایتی مراکز بھی ناکام ہونا، ٹیکنالوجی کی لمبے عرصہ تک ترقی اور ابھار، سرمایہ داری کا جشن فتح منانے کی نئی روایت، اور پرانے بائیں بازو بلکہ دائیں بازو کے اصلاحات پسندوں کا بھی سوشلزم سے وابستہ توقعات کا تذکرہ چھوڑ دینا بھی شامل ہے۔ ٹریڈ یونین کی ضرورت، ہڑتال پر جانے کی طاقت، طبقاتی اتفاق کا کلچر اور سرمایہ داری کا جبر، پرانے صنعتی مراکز کے محنت کشوں کو یہ چیزیں چھپتی ہوئی بہت واضح ہوا کرتی تھیں۔ اب گذشتہ 150 سال کی سوشلسٹ روایات سے متعلق مغرب میں پرانی ختم ہوتی ہوئی نسل کی دھندلاتی ہوئی یادیں ہیں۔ پرولتاریہ اپنے پرانے گھر میں اپنے پرانے کردار کے بارے برائے نام شعور رکھتا ہے۔ ان کا کام بلکہ ان کی طبقاتی شناخت بھی جو شاید ان کو یاد ہے بکھر چکی ہیں۔ وہ اب بھی پرولتاریہ ہیں جو اپنی روزانہ کی قوت محنت بیچ کر زندہ رہ رہے ہیں۔ عموماً ان کا بڑا حصہ ماضی میں جتنی پیداوار ایک فرد کرتا تھا، اب اس سے کہیں زیادہ پیدا کرتا ہے۔ ان کی روزی اور حقوق پر سرمایہ دارانہ حملہ کی مدافعت کرنے کے لئے ان میں مشترکہ جدوجہد کے علاوہ کچھ متبادل نہیں ہے۔ ان کو نئے سرے سے پکٹ لائن پر ڈٹنا ہوگا جو کہ اتحاد کا سبق ہے۔

آنے والے وقتوں میں جدوجہد کرنے کیلئے گذشتہ تجربات سے سیکھنا ہوگا۔ آبادی کی ان پرتوں میں پرولتاری شعور اجاگر کرنا ہوگا۔ بہرحال پرانی روایات مشکل سے ختم ہوتی ہیں۔ برطانیہ میں ریلوے کارکنوں، سول سروسز، ٹیچرز وغیرہ کی ہڑتالیں ہوتی رہی ہیں۔ کئی نئے حقائق نے محنت کشوں کو اکٹھا ہونا سکھلایا ہے۔ پرولتاریہ

کے مخصوص حجم اور وزن میں ہر جگہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ نیا دھواضح طور پر نوآبادیات میں واقع ہوا ہے۔ پرکار پوریشنز کی اجارہ داری میں پیداوار کی کثرت ہونے سے پیٹی بورژوا کلاس میں بلاک کی آئی ہے۔ محنت کش طبقہ پہلے سے کہیں زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ انفارمیشن کے انقلاب اور ماس کمیونیکیشن کی وجہ سے موجود محنت کش طبقہ اپنے آباؤ اجداد سے کہیں بہتر طور پر حالات سے آگاہ ہیں۔ دنیا سکڑ گئی ہے اور بین الاقوامی شعور اتنا بلند ہو گیا ہے کہ ماضی میں اس کا تصور بھی ناممکن تھا۔ ان حقائق نے عالمی سطح پر پرولتاریہ کو مضبوط کیا ہے۔ ان حقائق کو یکجا دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے اس طرح ایسا کلچر پیدا ہو گیا ہے کہ جو مختلف قوتوں کا معاشرے میں توازن اور طاقت قائم کرتا ہے بلکہ مقابلتاً خاموشی کے عرصہ جس میں 70 کی دہائی کے مقابلہ میں وقت ضائع ہوا۔ یہی کلچرل موجودگی ہے کہ سرمایہ داری بھی فیئر ٹریڈ اور اخلاقی پشت پناہی وغیرہ کی صورت میں خراج تحسین پیش کر رہی ہے۔ یہ ناقابل فراموش حقیقت سرمایہ دار کے راستے میں حائل ہے کہ وہ معیار زندگی کو نیچے لا سکے۔ 1930ء کی دہائیوں کی وجہ سے جو معاشرتی تبدیلی آئی ہے اس کی وجہ سے ساتھ انتہائی دبے کچلے ہوئے معاشرے کے حصے خصوصاً عورتیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنے غلامانہ کردار سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے کئی صورتوں میں محنت کش طبقہ کی جدوجہد کا ہراول دستہ بن چکے ہیں۔ نسلی اقلیتیں اور مقامی قبائل اپنے حقوق مانگنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جس نے عالمی سطح پر شعور کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کا محنت کش طبقہ بین الاقومیت میں ڈھل چکا ہے۔ جس کی وجہ کئی دہائیوں سے کریبین اور برصغیر پاک و ہند سے ہونے والی امیگریشن ہے جس کے نتیجے میں ان مزدوروں نے برطانیہ کے مقامی مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ اسی طرح امریکہ میں میکسیکن مزدوروں کا حال ہے۔ شمالی افریقہ کے مزدور فرانس، ترکی کے جرمنی میں اور مشرقی یورپ کے مزدور مغربی یورپ میں وغیرہ میں ہیں۔ اب رد انقلاب کے لئے کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ اپنے وسائل کو بڑھانے کے لئے نوآبادیاتی علاقوں سے مزدور بھرتی کرے جو پیدل فوج بھرتی کرنے کا محفوظ ذخیرہ تھا۔ جس طرح فرانس نے سپین کی سول وار میں "مورز" کو بھرتی کر کے کیا تھا۔ ان حالات میں محض حقائق بتا کر قائل کرنے کی صلاحیت نے لوگوں کو شعوری طور پر اتنا بلند کر دیا ہے کہ وہ کارپوریٹ حکمرانی کا ادراک کر سکیں۔ ناقابل یقین حد تک لوگوں تک پہنچائی جانے والی اطلاعات جن کا ذریعہ انٹرنیٹ، 24 گھنٹے نیوز چینل، موبائل فون ٹیکنالوجی وغیرہ ہیں نے انتہائی حد تک اس عمل میں تیزی پیدا کی ہے۔ آج معاشرے میں موجود بوجھ ہے اور ہر چیز صاف دکھائی دیتی ہے جس کا ماضی سے کوئی مقابلہ نہیں۔ وقفہ وقفہ سے ہونے والی اصلاحات کے قابل عمل ہونے پر غیر یقینی کی صورتحال ہوا میں تحلیل ہو چکی ہے۔ یہی صورتحال درمیانی راستہ اختیار کرنے یا فوری سطح پر مسئلہ کے حل کے سلسلے میں ہے۔ عام لوگوں کی معلومات تک رسائی اور وسیع پیمانے پر اصل مسائل کے اہم ذرائع جن کو روکے

میں مطلق العنان حکومتیں بھی بے بس ہیں۔ یعنی 20 سالہ دور کے خاتمہ پر بین الاقوامی مخالف احتجاج اس کی باخبری صورت میں سامنے آیا ہے۔ ہزاروں نوجوانوں اور کارکنوں نے ملکی سرحدوں کو عبور کیا اور سرمایہ دار لیڈروں کے خفیہ ٹھکانوں کا سیاٹل، پراگ اور جینوا میں گھیراؤ کر لیا۔ اس بے ربط اور اچانک احتجاج کا پھوٹ پڑنا حکمرانوں کے لئے خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھا۔ جینوا میں ان احتجاج کرنے والوں کے خلاف جبر سے بھرپور وحشیانہ رویہ روا رکھا گیا۔ یہ تحریک دہشت گردی کے خلاف جنگ نے وقتی طور پر منقطع کر دی تھی۔ یہ صورتحال 9 نومبر 2001ء میں امریکہ میں مخصوص نشانے پر حملوں کے بعد پیدا ہوئی جو بذات خود امریکی سامراج کی جڑ حالی کمزور ہو جانے کی ایک علامت ہے۔ جلد ہی بعد از اں 15 فروری 2003ء موجودہ زمانے کا واضح اور منفرد واقعہ ہوا کہ عالمی سطح پر تین کروڑ لوگ حرکت میں آئے اور انہوں نے بیک وقت عراقی عوام کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔

گلوبلائزیشن اور محنت کش طبقہ

گلوبلائزیشن کافی حد تک مکمل احساس و ادراک کا اظہار کرتی ہے۔ ایسا عمل جس کو 1848ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو میں بڑی ذہانت سے پیش کیا گیا تھا۔ یہ کلاسیکی ڈھانچہ سرمایہ داری ہے یعنی مارکسزم کو یکتا قرار دینے کی دلیل۔ یہ پھر بھی نادیدہ نتائج پیدا کرتا ہے۔ دور دراز براعظموں میں عظیم الجثہ نیا پرولتاری طبقہ آنکھیں کھول رہا ہے جو سرمایہ دارانہ طاقت کے مراکز سے بہت دور ہیں۔ اس دوران سرمایہ اس طرح اکٹھا ہو رہا ہے کہ پہلے اس طرح کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک ایسا حکمران طبقہ جو بدروح کی طرح ٹیکنالوجی اور فوجی لحاظ سے مسلح ہے جو ایسے معاشرتی طبقہ پر انحصار کرتا ہے جو کلرکوں اور چھوٹے موٹے کام کرنے والوں پر مشتمل ہے جو اس حکمران طبقہ کو سہولیات کی فراہمی انجام دیتا ہے۔ پچھلی دو دہائیوں کے دوران ہونے والی معاشی ترقی جزوی طور پر نوآبادیاتی دنیا کو پیداوار کی برآمد کرتی تھی۔ پرولتاریہ کا پیداوار سے متعلق ضروری اور اہم حصہ روایتی ترقی یافتہ ملکوں میں غائب ہو گیا ہے اور اب زیادہ سے زیادہ تعداد میں لاطینی امریکہ، ایشیا اور چین میں جمع ہو رہا ہے۔ اس امر نے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں مزدوروں کی تنخواہیں کم کرنے میں مدد دی۔ اس چیز کا یہ اثر بھی تھا اس سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار نے لاکھوں مزدوروں کو عالمی معیشت کی طرف کھینچ لیا۔ ایسا دنیا میں پہلی بار ہوا۔ چھوٹے پیمانے پر پیداوار اور دیہاتوں سے لاکھوں لوگوں کو ملٹی نیشنل کمپنیوں نے کھینچ لیا۔ اس طرح چین، انڈیا اور برازیل میں بھاری بھر کم پرولتاری طبقہ معرض وجود میں آچکا ہے۔ پیداوار بنانے والے لاکھوں نوکریاں اپنے روایتی مراکز سے دوسری طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ امریکہ میں 1998ء اور 2005ء کے دوران مینوفیکچرنگ سے متعلق 30 لاکھ نوکریاں کم ہو گئیں۔ 1950ء میں امریکہ کا تیسرا حصہ مزدور مینوفیکچرنگ میں کام کرتا تھا جو اب کم ہو کر 12.5 فیصد بلکہ کچھ کے خیال میں 10 فیصد رہ گیا ہے۔ برطانیہ میں ٹریڈ یونین ازم صرف پبلک سیکٹر میں رہ گیا ہے جو کہ تیزی سے سکڑ رہا

ہے۔ وہ بھی دن تھے کہ بہت بڑی فیکٹریاں شاپ سٹیوورڈ چلاتے تھے اب تو وہ کمپنیاں عرصے سے غائب ہو گئی ہیں۔ 2005ء میں چین میں فولاد کی ٹوٹل پیداوار امریکہ میں فولاد کی ٹوٹل پیداوار سے زیادہ تھی کیونکہ چین نے براہ راست بیرونی سرمایہ کاری کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے۔ جس نے بڑھتے ہوئے سرمائے کے سیلاب میں اضافہ کیا کیونکہ چین کے پاس غلام قسم کی بے تحاشا لیبر تھی اور وہ دہائیوں کی منصوبہ بند معیشت سے بچے والے انفرا اسٹرکچر سے حاصل ہونے والے فوائد تھے اگرچہ یہ پلاننگ، وسائل کے ضیاع اور بدعنوانی پر مبنی تھی۔

انڈسٹریل ورک فورس کی بھاری بھرکم بٹالین اپنے روایتی مراکز میں عموماً نہیں پائی جاتیں۔ بالکل ایک نئی زمین پر موجود ہیں۔ ترقی پذیر دنیا میں زبردست پرولتاری کلاس وجود میں آ چکی ہے۔ عالمی لیبر مارکیٹ میں داخل ہونے پر سابقہ سوشلسٹ ریاستوں کی بھاری بھرکم ترقی پذیر لیبر فورس موجود تھی۔ اس وقت انڈیا، چین اور مشرقی یورپ میں 1.77 ارب تنخواہ دار موجود ہیں۔ اس میں ایک ارب ورک فورس غیر ترقی یافتہ ممالک میں موجود ہے جس میں روایتی ترقی یافتہ دنیا کی 4 کروڑ 60 لاکھ مزید مزدوروں کی تعداد جمع کی جا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں دنیا کے تین کروڑ تنخواہ دار مزدوروں کے حوالے سے مغرب میں ایک مزدور کے مقابلے میں پانچ چین، انڈیا، روس، لاطینی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا وغیرہ میں موجود ہیں۔ جنوب میں (سابقہ نوآبادیاتی ممالک) انڈسٹریلائزیشن کے عمل اور مشرق کی پرائیویٹائزیشن نے گلوبل سطح پر محنت کش طبقہ کو دوگنا کر دیا ہے جس سے تاریخ میں پہلی مرتبہ عالمی سطح پر آبادی میں پرولتاریہ کی اکثریت ہے۔

مزید برآں وہ حقائق جنہوں نے سابقہ دور میں محنت کش طبقے کو تقسیم کر دیا تھا تیزی سے نیچے جا رہے ہیں۔ معیار زندگی کے حوالے سے آمدنیوں میں فرق کو مٹانے کے لئے تبدیل ہونے والا رجحان موجود ہے اس عمل کے نتیجہ میں جنوبی کوریا، تائیوان، سنگاپور، ہانگ کانگ اور تھائی لینڈ میں آزادانہ محنت کش طبقہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ بات اب دوبارہ چین، انڈیا، مشرقی یورپ اور لاطینی امریکہ والی بنیادی لیبر روایات کو روشن کر رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ مغرب میں نظر نہ آنے والا Casualisation کا عمل جاری ہے۔ گلوبلائزیشن نے تارکین وطن مزدوروں کے استحصال اور لیبر کی تنخواہوں میں کمی اور ان کے حقوق اور حالات کار کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ مشینی خودکاری کی وجہ سے لیبر فورس میں اتنی کمی کر دی گئی ہے کہ اب پیداوار کی ترسیل اور تقسیم پر آنے والا خرچ مینوفیکچرنگ پر آنے والے خرچ سے بڑھ گیا ہے جبکہ کساد بازاری اور مندی کی وجہ سے ڈالر کی قدر میں کمی ہو رہی ہے تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں نے Out-Sourcing اور جگہ تبدیل کرنے کی وجہ سے لاگت بڑھا دی ہے صنعتی پرولتاریہ کو نئے علاقوں میں منتقل کرنے کی وجہ سے بین الاقوامی سوچ میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ دنیا کی پرانی سرفرقی تقسیم اب موجود نہیں ہے۔ تاریخ میں پہلی بار اب حقیقی عالمی محنت کش طبقہ وجود میں آیا ہے۔ تمام براعظموں

میں بین الاقوامی پرولتاریہ اپنی جڑیں پیدا کر رہی ہے۔ لاطینی امریکہ میں سارے برصغیر کی سطح پر بغاوت نظر آ رہی ہے۔ مشرقی ایشیا اور چین میں شروعات ہو رہی ہیں جو ٹریڈ یونین ازم کی بہت بڑی لہر میں تبدیل ہو جائے گی۔ جو عالمی سوچ کو بدل کر نئی جہت دے سکتی ہے یہ وہ جگہ ہے جو مستقبل کے "انٹرنیشنل" کی جنم بھومی ہوگی۔

لیون ٹراٹسکی نے لوگوں کی سوچوں اور شعور کے تیزی سے نئی جہتوں میں تبدیل ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے "لوگ غیر محسوس انداز میں قدامت وحشی کے زرعی پیداواری نظام سے صنعتی پیداواری نظام میں سینکڑوں سال آگے چلے جاتے ہیں۔ روس میں پرولتاریہ نے زمانوں پر محیط عرصہ میں آہستہ آہستہ سر نہیں اٹھایا جیسا کہ انگلینڈ میں ماضی کا بوجھ ساتھ اٹھائے پرولتاریہ وجود میں آیا۔ روس میں چھلانگوں کی صورت میں ماحول اور تعلقات میں تبدیلی آئی اور ایک اچانک تسلسل کی صورت میں اپنے ماضی سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ یہ وہ حقیقت ہے جو زاروں کے جبر کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے روسی محنت کش طبقہ کو انقلابی سوچ کے دلیرانہ نتائج قبول کرنے پر آمادہ کیا"۔ چین میں روس کی طرح جہاں کسانوں میں زمانہ وحشی کے لکڑی کے بنائے ہوئے ہل کی ٹیکنالوجی کو مستقبل کی ہائی ٹیکنیکل فیکٹریوں میں بدلا گیا جو انقلاب کا باعث بنا۔ اسی طرح اب چینی مزدور خاصے عقلمندی سے بنیادی تبدیلی لائیں گے۔ 2005ء سے پہلے پیداوار میں اچانک کمی کی وجہ سے چین میں سرکاری طور پر بنائے گئے قانون نافذ کرنے کے حوالے سے لاء اینڈ آرڈر نافذ کرنے کے 9 ہزار واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ جیسے جیسے تنخواہوں میں کمی اور فیکٹریوں کی بندش ہوگی اس قسم کے واقعات کئی گنا بڑھ جائیں گے۔ ایک طرح سے یہ چین کی فیکٹریاں ہیں جہاں زیر زمین نوزائیدہ ٹریڈ یونین ازم ہے جو مستقبل میں نسل انسانی کی آزادی کی بنیاد ثابت ہوگا۔ چینی مزدوروں کو ضرورت پیش آئے گی کہ وہ عالمی سطح پر اپنے ساتھی مزدوروں کے ساتھ مل کر چلیں اس طرح چین میں اسمبلی کرنے والے مزدور، انڈیا کے سوفٹ انجینئرز، یورپ کے سروس ورکرز اور اونٹاریو کے آٹو ورکرز مل کر ایک نیا اتحاد اور یکجہتی پیدا کریں گے۔ پرانے صنعتی ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کو بڑا اہم کردار ادا کرنا ہے یہ کام وہ لوگ کریں گے جو یورپ میں پرانی لیبر روایات کے امین ہیں تاکہ وہ نئی پیدا ہونے والی پرولتاریہ کلاس کے ساتھ یکجہتی پیدا کرنے کے لئے گذشتہ سو سال کا قیمتی تجربہ کو شیئر کریں جن کے درمیان بہت بڑا جغرافیائی اور تہذیبی گڑھا ہے۔

کیا کوئی راہ فرار موجود ہے؟

موجودہ معاشی بحران شاید اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے جس کی طرف ماہرین معاشیات نے اس کے شروع ہونے سے قبل اشارہ کیا تھا۔ سرمایہ داری نظام کے لئے یہ مشکل وقت ہے۔ بیشک ایسا سوچنا دلچسپی سے خالی نہیں جو سرمایہ دارانہ نظام سے متعلق ماہرین الٹی پلٹی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ ایسی نئی تکنیکی ایجادات ہو سکتی

ہیں جو آنے والے بحران کی آبیاری کریں گی۔ اگر مزدور طبقہ اقتدار پر قبضہ نہیں کرتا تو خون خرابہ اور بڑے پیمانے پر ماحولیاتی بربادی کے بعد ممکن ہے سرمایہ داری نظام اپنی بقا کا کوئی راستہ نکال لے۔ اجارہ دارانہ سرمایہ داریت میں پیداوار میں باقاعدگی لا کر قیمتوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اوپیک تیل پیدا کرنے والی ریاستیں قیمتیں مقرر کرنے کیلئے باقاعدگی سے باہم اجلاس کرتی ہیں کہ ان کے منافع زیادہ سے زیادہ ہوسکیں جو کہ اکثر منافعوں کو فیڈ ادے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ پیداوار کے سوشلسٹ پلان کے مطابق جدید پیداواری صلاحیت کو جدید تکنیک کے مطابق پوری طرح بروئے کار لا کر پیداواری سطح بڑھائی جاسکتی ہے۔ معاشرتی طور پر معیشت کے تمام فائدہ مند سیکٹرز کے لئے جیسے جیسے پیداواریت بڑھے گی، کام کرنے کے اوقات میں کمی کی جاسکتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کو جس رکاوٹ کا سامنا ہے وہ ایک بار پھر سوشلسٹ نظام پیداوار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

سرمایہ داری نظام کے لئے یہ مشکل ہے۔ لیبر کی بڑھتی ہوئی پیداواری صلاحیت نئی ایجادات کا نتیجہ ہے پھر بھی آخر تجزیے کے لحاظ سے سرمایہ داری نظام میں بذات خود اس طرح کی تبدیلیاں آتی ہیں۔ مستقل سرمائے میں مسلسل تبدیلیاں (یعنی ٹیکنالوجی اور فکسڈ اثاثے) ہو رہی ہیں۔ جیسے ہی لیبر میں سرمایہ کاری کا تناسب کم ہوتا ہے سارا نظام مجموعی طور پر متاثر ہو رہا ہے یعنی منافع کی شرح کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بطور سسٹم لیبر میں سرمایہ کاری کم کی جاتی ہے۔ معاشی ترقی کے دوران اس رجحان کو عارضی طور پر کنٹرول کرنا ممکن ہوتا ہے خاص طور پر وہ کمپنیوں کے لئے جو منڈی کے بڑے حصے پر قابض ہو جاتی ہیں لیکن مندی کے زمانے میں خصوصاً جوابی طور پر الٹا ردعمل کرتا ہے۔ کم از کم معیشت کے کچھ حصہ میں سرمایہ داری نظام ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ پیداواراتی ترقی یافتہ ہو جاتی ہے اس کی اشیاء بغیر کسی قیمت مل سکتی ہیں۔ کیونکہ میوزک انڈسٹری میں زیادہ تر یہی مسئلہ ہے اور کمپیوٹر سافٹ ویئر کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ 1950ء سے 1960ء میں ریکارڈ میوزک سے جو منافع کا بڑا ذریعہ تھا اب بغیر کسی قیمت کے آن لائن دستیاب ہے۔ کمپیوٹر کی صنعت میں اب بہت سی اشیاء ویسے ہی دے دی جاتی ہیں۔ جزوی طور پر کچھ اشیاء سخت مقابلہ کے پیش نظر دی جاتی ہیں لیکن بہرحال ٹیکنالوجیکل ترقی کے باعث فی آئٹم لاگت کے پیش نظر مفت دے دی جاتی ہیں۔ اگر سرمایہ داری نظام مزید ترقی کے متبادل ذرائع تلاش کر بھی لیتا ہے پھر بھی یہ نظام اس کے زوال کا باعث بنتا ہے۔ سرمایہ داری نظام معیشت کے ماہرین ایک سبز انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ تمام بڑی عظیم عمارتوں پر شمسی توانائی کے پینل لگانے کی باتیں کر رہے ہیں یا ہوا سے چلنے والی ٹربائن کی بات کرتے ہیں یا ٹرانسپورٹ کو ماحول دوست بنانے کی بات کرتے ہیں۔ ان کا مقصد مکمل استحکام لانا اور منافع کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہے نہ کہ کرہ ارض کو بچانا ہے۔ اس طرح کی وسیع پیمانے پر پیداوار یقیناً تیل اور موٹر انڈسٹری میں بحران پیدا کردے گی۔ یہ کچھ نئے شعبہ جات میں سرمایہ دارانہ سرمایہ کاری سے منافعوں کو بڑھا دے گا لیکن اس طرح کی لمبے عرصے کی سرمایہ کاری سے کمپنی منافعوں میں کمی کا باعث بنے گا کیونکہ ابتدائی سرمایہ

کاری کے بعد زیادہ تر توانائی مفت ہو جائیں گے کیونکہ اس میں مزید لیبر کی گنجائش نہیں رہے گی۔ میکینکس پر کم سے کم خرچ آتا اس کے علاوہ ہوگا لہٰذا جب اس نے اپنے آپ کو ختم کرلیا تو ایک نئی قسم کی سرمایہ داری گرم بازاری دنیا کو سوشلزم کیلئے گلے سڑنے کی حد تک پھلوں کی طرح پکا کر تیار کردیگی۔ گر ایسا معاشرہ بحران کے حل کی تلاش کے دوران وقوع پذیر ہوگا۔ کچھ مغربی ماہرین معاشیات نے کبھی نہ پورے ہونے والی مارکیٹ کی طرف اشارہ کیا ہے انہوں نے چین کی ترقی میں موجود وسعت کے لحاظ انہوں نے اس بات کو نظر انداز کردیا ہے کہ چین کی ترقی میں موجود وسعت کی ایک وجہ نوکرشاہی اور بدعنوانی کی آدھی صدی ہے جس میں منصوبہ بندی اور ملکیت سرکاری تھی۔ انفراسٹرکچر کے حوالے سے تعلیم انتہائی ضروری عمل تھا تاکہ سرمایہ داری نظام جڑیں پکڑ سکتا ضروری انفراسٹرکچر کے حوالے سے سرکاری طور پر سرمایہ کاری اور تربیت ورک فورس بہت ضروری تھی۔

افریقہ

یہ صورتحال افریقہ کے سلسلہ میں بھی نظر آتی ہے یہ ایسا براعظم ہے جس میں زیادہ تر زرعی قسم کی گھریلو معیشت ہے جس میں محدود لمبی مدت کی تجارت کی گنجائش ہے۔ جو فقرا اور فصلیں اگانا اور کان کنی میں اضافہ پر مشتمل ہے۔ مقامی مارکیٹ جس میں صرف برآمدات شامل ہیں وہاں صرف ضائع ہوتا ہوا انفراسٹرکچر اور ان ٹرینڈ لیبر فورس ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو بیرون ملک بھاؤ اور لیبر کا پردیس جانے کا رجحان وسائل پر مزید بوجھ کا باعث ہے۔ تصوراتی حد کو چھوتی ہوئی غربت کا یہ عالم ہے کہ 1960ء کے عشرہ کی غربت جو آبادی کا 11 فیصد حصہ پر مشتمل تھی اب 50 فیصد تک بڑھ گئی ہے۔ 3 کروڑ 40 لاکھ سے زیادہ تعداد میں لوگ 1.25 ڈالر روزانہ آمدن پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی کی سرمایہ دارانہ پیداوار کی کھپت کیلئے ممکن ہے "پمپ پرائمنگ" کے نظریہ کو بروئے کار لا کر پیداوار کی کیفیت کے مطابق منڈی پیدا کر کے معیار زندگی کو بلند کیا جاسکے۔ طاقتور سامراج اور افریقہ کے درمیان اقتصادی تعلقات کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی محدود گنجائش ہے۔ اٹلانٹک غلاموں کی تجارت کے زمانے سے جو سولہویں صدی کی مغربی طاقتوں کی نو آبادیات بنانے کے عمل کے دوران ہوئی، مالا مال یورپ کے لئے افریقہ کے وسائل کی خوب لوٹ مار کی۔ افریقہ کی نو آبادیاتی نظام سے آزادی وہاں کے لوگوں کے لئے بہت بڑا واقعہ تھا لیکن اس وجہ سے وسائل کو لوٹنے کا عمل بند نہیں ہوسکا۔ آج دنیا کے 15 امیر ترین لوگوں کے پاس اتنی دولت ہے جو افریقی ممالک کی کل سالانہ پیداوار یعنی جی ڈی پی کے برابر ہے اس میں جنوبی افریقہ شامل نہیں ہے جس میں 4 کروڑ 50 لاکھ لوگ آباد ہیں اور جو نائیجیریا کی آبادی کے برابر ہے۔ مغربی امپیریل ازم کے لوگ ڈینگ مارتے ہیں کہ انہوں نے افریقہ کو 1960ء سے 2006ء تک 580 ارب ڈالر کی امداد فراہم کی مگر اس دوران افریقہ کی زیادہ تر معیشتیں منجمد اور بلکہ انحطاط کا شکار

دیں جس کی وجہ سے ان کو مستقل لوٹنا ہے۔ افریقہ کو جتنی مدد دی گئی تھی اس سے تین گنا رقم قرضوں کی ادائیگی کی واپسی پر خرچ ہو گئی جو مغربی ممالک کو کی گئی۔ علاوہ ازیں موجودہ گرم بازاری تک جو اب ختم بھی ہو چکی ہے تجارت کی شرائط جس میں مینوفیکچرڈ اشیاء پر لاگت کا مقابلہ بنیادی اشیاء جو افریقی برآمدات کا سب سے بڑا حصہ ہیں سے کیا جاتا ہے یہ افریقہ کے خلاف بطور ہتھیار استعمال ہوتا ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے بے تحاشہ مقدار میں افریقی فالتو دولت براعظم افریقہ سے سامراجی طاقتوں کی طرف کھینچی جاتی رہی ہے۔ 2006ء میں حتیٰ کہ اقوام متحدہ کی تجارت اور ترقی پر کانفرنس نے کہا ہے کہ اس بارے میں کی جانے والی سٹڈی سے ثابت ہوا ہے کہ 1980ء میں افریقہ کو دی جانے والی امداد سے ناموافق شرائط کی وجہ سے افریقہ کو ہونے والے نقصانات کا ازالہ نہیں ہو سکا۔ تیز اور مستحکم ترقی کے لئے صرف وسائل کی فراہمی کا معاملہ لیتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ سامراجی ممالک میں بیک وقت زرعی پیداوار کے سلسلہ میں تحفظ فراہم کرنے کیلئے دی جانے والی امداد کا اثر افریقہ پر پڑتا ہے کیونکہ ادائیگی افریقہ کرتا ہے۔ کپاس کی برآمدات کے حوالے سے یہ تقریباً 500 ملین ڈالر سالانہ ہے۔ یورپین یونین ممالک میں ایک گائے کیلئے دی جانے والی سب سڈی 913 ڈالر ہے جو کہ افریقی سحارا میں فی کس آمدن کا تقریباً دوگنا ہے جو 490 ڈالر فی کس بنتا ہے۔

سوشلسٹ طریقہ پیداوار جو مکمل روزگار فراہم کرنے، تعلیم اور اعلیٰ ہنرمند معیشت کی ضمانت دیتا ہے پیداوار کو بڑھانے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہے تاکہ افریقی باشندے نہ صرف اعلیٰ معیار زندگی سے فیض یاب ہو سکیں بلکہ عالمی سطح پر پیداوار میں بھی اضافہ کر سکیں۔ موجودہ شماریات اس بات کا مظہر ہیں کہ وہ انسانی وسائل کے تناسب کے حوالے سے فرد دوم کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی وجہ آزاد منڈی کی معیشت ہے۔ گرم بازاری کے باوجود بہت سارے افریقی ممالک میں اونچے درجے کی بیروزگاری تھی جو اب خوفناک حد تک پہنچ چکی ہے۔ انگولا میں 70 فیصد، لائبیریا میں 80 فیصد، سینیگال 40 فیصد، صومالیہ 47 فیصد، زمبیا 70 فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ اس میں عورتیں بیروزگاری کا زیادہ شکار ہیں۔ تقریباً 22 لاکھ قتل عام، خانہ جنگی اور بغاوتوں کی وجہ سے خوفزدہ ہیں۔ پورے براعظم افریقہ میں مہاجرین کا مسئلہ دائمی بن چکا ہے۔ ماضی میں امداد (Aid) کے پروگراموں کا مطمع نظر نجی شعبے میں ترقی کا ایک ابھارنا تھا۔ 2009ء میں G-20 ممالک ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ مسائل کا حل نکالیں۔ کہا گیا کہ 150 ارب پونڈ اضافی امداد کے طور پر دنیا کے غریب ترین ممالک کو دیئے جائیں گے جن میں زیادہ تر کا تعلق براعظم افریقہ سے ہے۔ بیک پروگرام تفصیل کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔ یہ پروگرام 23 سال پر محیط ہوگا اور یہ رقم زیادہ تر گرانٹ کی بجائے قرضوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کے زیادہ حصہ کو آئی ایم ایف کنٹرول کرے گا جو ضروری نیولبرل شرائط عائد کرنے کے معاملے میں بدنام ہے۔ اقتصادی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ایسے اقدامات حقیقت سے دور ایک خیالی دنیا کا خواب ثابت ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ نتائج نکلیں گے ان کے بارے

کیا کیا جائے؟ براعظم افریقہ میں ریاستی نظام کمزور ہیں۔ جس میں کمزور آمریت اور کہیں کمزور اور برائے نام جمہوریت کے پیوند لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً صومالیہ میں ریاست ٹوٹ کر پوری طرح گر گیا ہے۔ ریاستی سطح کی بدحالی عام ہے۔ یہ تمام سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے۔

اگر معاشی ترقی ہوتی ہے تو یہ افریقی پرولتاریہ کا حجم بڑھا دیگی اور انہیں دلیر کر دے گی۔ آبادی کا قابل لحاظ حصہ صنعت میں کام کرتا ہے۔ 9 کروڑ 40 لاکھ کی آبادی میں سے ایک کروڑ تیس لاکھ لوگ غیر زرعی شعبہ کے کارکن ہیں جو آبادی کا 13.87 فیصد ہے۔

اس طرح براعظم کی سماجی تشکیل میں اس کا جھکاؤ مزدور طبقے کی طرف ہے اس کی نسبت جو 1947ء کے روسی انقلاب کے موقع پر تھی۔ نائجیریا میں مزدوروں کی تعداد 18 فیصد، مصر میں 20 فیصد اور جنوبی افریقہ میں 32 فیصد ہے۔ ان ملکوں میں صنعتی مزدوروں کا تعداد کے لحاظ سے طاقتور ارتکاز ہے جنہیں اپنی طاقت کا زیادہ احساس اس وقت ہوگا جونہی صنعتی پھیلاؤ میں کمی واقع ہوگی۔ اس براعظم میں اگرچہ غیر ملکی امداد اقتصادی ترقی کا باعث ہے مگر جس طرح یہ استحکام کا باعث ہے اسی طرح ان کمزور حکومتوں کو غیر مستحکم کرنے میں بھی یہ کردار ادا کرے گی۔ دائمی غذائی کمی اور فاقہ کشی کی وجہ غذائی اور توانائی کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ہیں۔ جس کی وجہ سے پہلے ہی وہاں پر سامراج کے خلاف مدافعت کا عنصر موجود ہے۔ 2007ء میں برکینا فاسو، آئیوری کوسٹ، مصر اور تیونس میں غذائی کمی کی وجہ سے فسادات ہو چکے ہیں۔ اسی طرح مصر، گنی، زمبیا اور جنوبی افریقہ میں بڑی بڑی ہڑتالیں کی گئیں۔ یہ اس کردار کی طرف اشارہ ہے جو یہ براعظم عالمی انقلاب کے سلسلہ میں ادا کریگا۔

لاطینی امریکہ

سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات آج کے لاطینی امریکہ میں لاطینی امریکہ کے صنعتی مزدوروں اور کسانوں میں روایتی بنیادی سوشلسٹ انقلاب کے حوالے سے خیالات کا دوبارہ پیدا ہونا ہے۔ گو کہ لا اور ارجنٹائن میں عوامی پروگرام کی بنیاد پر تسلسل کے ساتھ "بائیں بازو" کی کئی حکومتوں کا اقتدار میں آنا ہے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ کچھ واقعات ایسے ہیں جن سے مقامی لوگوں کی بڑھتی ہوئی مدافعت ظاہر ہوتی ہے۔ بڑے عوامی حلقوں کو نیچے سے حرکت میں لائے بغیر یہ حکومتیں سرمایہ داری نظام کا تختہ الٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں لیکن دبے کچلے لوگوں کی تحریک براعظم کی سطح پر وحشی قسم کے مطلق العنان حکمرانوں کی بغیر وقفہ کے تسلسل کے ساتھ حکومت دیکھ چکی تھی لہٰذا تجدید شدہ لڑائی اور بغاوت کی صورت میں یہ حقیقت بھاری بھرکم عوامی ابھار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان حکومتوں میں زیادہ ممتاز موجودہ زمانے کی ہوگوشاویز کی وینزویلا میں حکومت ہے جو کسی واضح مضبوط طبقے کی بنیاد کے بغیر معرض وجود میں آئی تھی۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہوگوشاویز اپنی یونائیٹڈ سوشلسٹ پارٹی آف

وینزویلا کی حکومت کو مزدور طبقے کی مضبوط بنیاد فراہم کرنا چاہتا ہے۔ یہ واضح نہیں ہے کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوگا یا یہ پارٹی نوکر شاہی کے دلدل میں پھنس کر رہ جائے گی۔ بہرحال ہوگو شاویز یہ کوشش کر رہا ہے کہ وینزویلا کو ایک ریجنل طاقت بنا دے جس کی بنیاد وینزویلا کی تیل کی دولت ہو۔ امریکی سامراج جو روبہ زوال ہے لاطینی امریکہ کو اپنی قوت کے ساتھ متاثر کر رہا ہے۔ ماضی میں امریکہ اس حیثیت میں تھا کہ وہ اس خطے پر اپنی مرضی مسلط کر سکے۔ خطے کی کسی بھی حکومت نے جزوی طور پر بھی سرکشی کرنے کی کوشش کی تو اس کی آشیرباد سے تیزی کے ساتھ اسے جھکنے پر مجبور کر دیا گیا یا پھر اس کا تختہ ہی الٹ دیا گیا۔ اب وہ دن جا چکے ہیں۔ بہت سے عناصر امریکی سامراج کے مقابلے پر آ گئے اور اس طرح اسے کمزور کرنے کے عمل سے فائدہ اٹھا کر لاطینی امریکہ میں اس کی دراندازی کا راستہ کامیابی سے روک رہے ہیں۔ ان میں آگے آگے چین، روس اور ایران جیسی ثانوی طاقتیں بھی اس عمل میں مصروف ہیں۔ امریکہ کی کونسل برائے خارجہ ریلیشنز جو اس سلسلہ میں اہم ترین تھنک ٹینک ہے نے اپنی 2008ء کی رپورٹ میں واضح کیا "لاطینی امریکہ میں غالب اثر رکھنے کے حوالے سے امریکہ کا وہ زمانہ جو 1970ء کے آخری عشروں پر مشتمل تھا گزر چکا ہے" لاطینی امریکہ عمومی اقتصادی توڑ پھوڑ کے تجربے میں سے گزرا ہے جو 1980ء کے عشرے والے نیولبرل ازم کو اپنانے کا باعث بنا ہے تب سے جاری عرصہ پورے ریجن میں اقتصادی بحران سے شدت کے ساتھ متاثر ہوا ہے۔

اس سے آگے طبقاتی جدوجہد ہے

معاشرہ کو بدلنے کی خواہش کی تکمیل کے بارے میں مستقبل قریب میں واقع ہونے والے حالات ہی بتائیں گے۔ اگر اپنا تقرر خود کرنے والے ماضی کے رہنماؤں کی سیاسی بے راہ روی، ذہنی اخلاقی صنعتی تنظیم گلوبلائزیشن کی وجہ سے جو اس پاگل پن کے مقابلے میں موجود محنت کش طبقہ نے کوئی شکست نہیں کھائی ہیں۔ عالمی پیمانے پر بیرا اعظم اور بیکٹر میں نئے سرے سے وجود میں آنے والے محنت کش طبقہ کا امتحان آنے والے وقت میں ہوگا۔ جدوجہد کے حوالے ان قوتوں کا توازن وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ شعور میں تیزی سے بلندی لانے کے حالات سازگار بنائے جا چکے ہیں۔ پرانے گھر لو کی تحلیلاتی اور اصلاحات پسندانہ رویہ دم توڑ چکے ہیں۔ محنت کش طبقہ کی معاشرے کو تبدیلی کی طرف حرکت دینے کے سلسلے میں فالج زدہ سیاسی جبر اور کارپوریشنوں کی آمریت کے مقابلے میں آنے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ اس بحران کا ابتدائی خواب جو اس باختہ کر دینے والا صدمہ ہوگا کہ کام کرنے کی جگہیں بند ہزاروں مزدور بے روزگار بے گھر ہو گئے۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد دھماکہ خیز ردعمل ہوگا، وسیع تر بیروزگاری سے اعتماد یکجہتی اور یکل قدری میں کمزوری آتی ہے یہ سچ ہے بہرحال ہڑتالی سے گہرائی میں اترتے وقت لازماً متاثر کن جدوجہد شروع ہو جائے گی۔ عظیم کساد بازاری میں امریکہ فرانس میں عالمی سطح کی

ہڑتالیں اور دھرنے دیکھنے میں آئے۔ آئس لینڈ اور لٹویا میں حکومتوں کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ایتھنز کی گلیوں میں نوجوانوں اور پولیس نے ایک دوسرے پر گولیاں چلائیں۔ فرانس کے محنت کش طبقہ کی شاندار روایات کے مطابق ایک ایک روزہ دو ہڑتالوں میں لاکھوں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ دوسری مرتبہ فیکٹریوں کے بڑے بڑے افسروں کو کمروں میں بند کیا۔ سپر مارکیٹوں میں مفت پکنک اور ضیافتیں کی گئیں۔ یہ عالمی سطح کے احتجاج کی شروعات ہے۔ کوئی بڑی منظم سوشلسٹ پارٹیاں ہوتیں تو بینکوں، خالی کمپنیوں، انڈسٹریل کارپوریشنوں کو قومیانے کیلئے سڑک ہی اجتماعات کرتیں، کارخانوں پر دوبارہ قبضہ ہوتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ 1968ء کے واقعات کے بعد ڈیگال نے کہا تھا "انقلاب کو نہیں روکا جا سکتا" یہ بہت بڑی بات ہے کہ آج موجودہ اقتصادی بحران کے بارے سب کی ایک ہی رائے ہے (یعنی سرمایہ داری کا خاتمہ اور سوشلزم کا پیغام) اب سیاسی پناہ لینے والوں غیر قانونی تارکین وطن، مفادات کی بھیک مانگنے والوں، سنگل ماؤں، پولینڈ کے ترکانوں حتیٰ کہ اسلامی دہشت گردوں کو بحران کے حوالے سے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا رہا۔ "بحران کا الزام سیاسی بے چینی پیدا کرنے والوں ورکروں، پناہ لینے والوں دستکاروں یا سوشل تبدیلیوں پر نہیں لگایا جا سکتا۔ کوئی سیاسی پارٹی ہوتی کہ طبقاتی نفرت بروئے کار لاتی سرمایہ داری کے خاتمے کی پالیسی دیتی تو انقلاب پہنچ کے اندر تھا۔

اس کے لئے سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے جو اپنے پلان کے لئے جمہوری طریقے سے منتخب کمیٹیاں بنائے جس کا اشتراک عمل ہو اور پرانے مالکوں، جرائم پیشہ فرد اور نوکر شاہی کو سبکدوش کر دے، دفاعی نگرانی کرے اور ذمہ داریاں لگائے اور اپنے اقدامات کو بین الاقوامی سطح پر پھیلائے، عام لوگوں کے ذہنوں کو نئے پروگرام، جوش اور اعتماد سے آشنا کرے۔ لڑائی کے وقت کو محنت کش طبقہ کیا کیا پوشیدہ ذرائع سامنے لائے گا ہمیں حیران کر دیگا۔ محنت کش طبقہ کرہ ارض کی آبادی کے نصف سے زیادہ ہے۔ صنعتی دنیا میں یہ بہت بڑی اکثریت ہے۔ ہماری بٹالین والے ابھی خاموش ہیں وہ شروع کر چکے تو تمام سوچ بدل دیں گے۔

انقلاب کا نیا چہرہ

یہ دور پے در پے شدید شکستیں جن سے محنت کش طبقہ کو ایک کے بعد ایک ملک میں دوچار ہونا پڑا: اٹلی میں فاشزم کی فتح، جرمن انقلاب کی شکست، برطانوی عام ہڑتال، Ausghwitd اور ہیروشیما انسانی تاریخ کے بدترین واقعات رونما ہوئے۔ 1900 اور 1930ء کے عشروں کے دو انقلاب میں سپر پولیس سٹیٹ وجود میں آئی جس کا انحصار بے دخل کیا گیا طبقہ تھا جو اقتصادی زندگی میں اتھل پتھل اور ٹریڈ یونین کے خلاف فاشزم کے خوفناک شکل اختیار کر گیا تھا۔ اب مہذب زندگی کا ٹوٹنا قاتل گروہی تعصب میں بدل جائے گا جو قومی نسلی اور گروہی زلزلوں کی فالٹ لائن پر آ جائے گا۔ سرمایہ داری کی طرف سے انقلاب کا فوری جواب فاشزم کی صورت ہوگا۔ مختصر

عناصر کو مزدوروں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ استحکام کے زمانے میں بھی حکمران طبقات گروہی تعصب کو زندہ رکھتے ہیں۔ 1920ء اور 1950ء کے عشروں میں فاشزم کی بنیاد بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ 1938ء میں 2 مئی میں پرولتاریہ چھوٹی بورژوازی کی طرح گھٹ کر بونی ہو چکی تھی اس میں چھوٹے دوکاندار اور چھوٹے پیمانے پر پیداوار بنانے والے کارکن 90 فیصد تک چھوٹے کسان تھے۔ چھوٹے کارکنوں کا ایک عظیم سیلاب تھا جو اس میں شامل ہو گیا تھا۔ موجودہ حالات میں سرمایہ دار فاشسٹ حربے استعمال کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ اب اپنی بقا کیلئے حکمران طبقات کیا نازیوں جیسے جتھوں کے ہاتھ اپنا مستقبل دے دیں گے؟ ویسے نسلی امتیاز حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہمیشہ سے موثر ہتھیار رہا ہے۔ نازیوں کی زیادتیاں بہت آگے چلی گئیں پیداکٹ چلانے والے اپنے آقاؤں کے سر پر تباہی سے آئے ان کے بیچ میں آدھا سے زیادہ یورپ آ گیا۔ تھوڑے عرصہ میں سرمایہ داری کے حوالے کا کام ہو گیا تھا۔ جنگ کے بعد کی ترقی مزدور طبقے کے لئے بہتر معیار زندگی، بہتر حالات کار اور بلند معیار تعلیم لائی۔ جو دو عشروں کی جدوجہد کا ثمر تھا۔ نوجوان نسل کی فوج مذکورہ سہولتوں میں کٹوتی اور جمہوری رویوں کو دبانے سے سخت ردعمل کرے گی۔ نسلی اقلیتوں پر دہشت گردانہ حملے دھماکہ خیز صورتحال پیدا کرے گا۔ امریکہ میں کالوں کی بغاوت، نوآبادیات کی آزادی کے بعد ان کا اعتماد اور خاص کر گورے نوجوانوں کے شعور میں بہت بڑی تبدیلی کا آنا تھا۔ فی الحال سرمایہ داری چھپ کر جمہوری حصوں کو پامال کریگے جن کا دہشت گردی سے تعلق نہیں، انہیں دہشتگردی مخالف قانون کے ذریعے دبائیں گے۔ مزدور طبقے کو تین طریقوں سے دبائیں گے جوابی انقلابی حربے پولیس کے بل بوتے پر مطلق العنان آمریت، نسلی بنیادوں پر غیر منظم جماعتی قتل عام محنت کشوں کی تحریک کو بدمعاش جنگی سرداروں کی طرح قتل کے بدلے قتل کے چکر میں ٹکڑے ٹکڑے کرنا، جیسا شمالی آئرلینڈ، یوگوسلاویہ، کوسوو، سری لنکا، روانڈا، سوڈان، چیچنیا، افغانستان، کانگو، جارجیا وغیرہ میں ہوا۔ برطانیہ میں نسلی خصوصاً مسلم عورتوں اور کالوں کے علاقوں میں اشتعال انگیز مارچ، دہشت گردی کنگ، پولیس جبر، امتیازی سلوک، ممنوعہ علاقے، حفاظتی کیمپ، ملکوں کو واپس بھیجنے کے مطالبے وغیرہ۔

عالمی پارٹی

1818ء میں یورپین انقلاب سے لیکر پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹھنے والی شورشوں، انقلابی شورشوں تک کوشش کی گئی کہ مزدور طبقے کی انٹرنیشنل پارٹی بنائی جائے۔ بہرحال پچھلے 85 سال میں انٹرنیشنل ورکرز پارٹی وجود میں نہ آ سکی۔ اس کی ورکنگ کلاس بہت بڑھ چکی تھی اور سرمایہ داری محفوظ ذخائر قطعی حد تک سکڑ چکے تھے۔ صرف سیاسی عناصر غیر موجود تھا جو اتفاقی عمل کو شعور سے آشنا کرتا عالمی انقلابی پارٹی تشکیل دینے کی آواز آتی پر لی ہے جتنا کہ سرمایہ داری نظام خود۔ جس وقت سمی بھر انقلابیوں کے لیڈروں نے مستقل مزاجی سے انٹرنیشنل ازم کا جھنڈا اٹھایا

طبقاتی تنظیمیں پھلی پھولیں اور طبقاتی حوالے سے آگے بڑھنے کا عمل تیز ہوا۔ 1848ء میں کمیونسٹ لیگ کی ابتداء 1864ء میں ورکنگ مین ایسوسی ایشن کی ابتداء 1889ء میں انٹرنیشنل اور 1919ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل تھا۔

یہ تمام ورکرز کی سطح پر ان کی جبلی و پیدائشی کوشش تھی کہ ایک نیا سماج تشکیل دیا جائے جس کا شاندار اظہار 1848ء کے انقلاب پیرس کمیون اور روس میں اس زمانے کے واقعات سے ہوتا ہے لہٰذا اس وجہ سے ان میں تاریخی یکجہتی ہو چکی ہے۔ ان یادگاروں میں ہر ایک نے بعد ازاں رد انقلاب میں تباہ ہو جانا تھا۔ کمیونسٹ لیگ اور IWMA مزدور طبقے کی بزدلی اور ریاست جبر کے نتیجے میں ختم ہو گئی۔ تھرڈ انٹرنیشنل کی زبان بندی طفیلی طبقے نے کر دی جو مزدور کے رہنما بن کر ابھرے یا مسخ شدہ سوشلسٹ نوکر شاہی نے جو نہایت طاقتور تھی۔ اس کے علاوہ نازی فتح کے بعد کی شورشوں نے کر دی۔ سیکنڈ انٹرنیشنل کے لیڈر ٹراٹسکی اور وٹیل کے مارکسزم کا سنٹرزم پسندی جو سنٹرازم کہلایا۔ اگست 1914ء کو پورے یورپ کے پیمانے کی ہڑتال کا مطالبہ کیا گیا جس کا مطلب ہونے والی سامراجی جنگ کو روکنا تھا۔ ہٹلر کے 1937ء میں اقتدار پر قبضے کے بعد روسی نوکر شاہی نے بھی جوابی انقلابی تھیوری پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ مطلب اقتدار پر قبضہ مضبوط اور سامراج کا جذبہ ٹھنڈا کرنا تھا۔ ٹراٹسکی نے اس موقع پر نئی انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی۔ 1938ء کی فاؤنڈنگ کانفرنس چوتھے انٹرنیشنل کو مدنظر رکھ کر کی گئی کہ یہ اپنے پیشرو سے بھی زیادہ طاقتور ہو گی۔ ٹراٹسکی کے پیش گوئی کی کہ آنے والی جنگ کے بعد انقلابی ابھار اٹھے گی اور چوتھی انٹرنیشنل اپنی پیشرو کا مہا پارٹیوں کو ایک طرف دھکیل دے گی۔ صرف ایک عشرے میں سیکنڈ اور تھرڈ انٹرنیشنل کی باقیات میں کچھ باقی نہ بچا اور سب مٹ گیا۔ یہ ٹراٹسکی کی پیش گوئی تھی۔ چین میں بھی یوروکوئیک پالیسیوں اور مشرقی یورپ کی ریاست میں بھی وہی حال تھا جس کی وجہ سے چوتھی انٹرنیشنل کی ناکامی کے بعد سرمایہ داری اور مضبوط ہو گئی۔ اس طرح ایک نیا انٹرنیشنل دور کا خواب بن گیا۔ 1938ء کی کانفرنس میں توڑ پھوڑ جنگ کے بعد کے حالات کو سمجھنے میں ناکامی تھی۔

انٹرنیشنل کی تشکیل

فطرت کے اعتبار سے مزدور طبقہ یکجہتی کی طرف مائل ہے اس لئے یقیناً ایک نئی انٹرنیشنل تشکیل پائے گی جس کے ذریعے وہ اپنی منزل کو پالے گی۔ سوشلسٹوں کا فرض ہے اس کی اہمیت کو سمجھ کر اس کی افادیت پر زور دیں کہ یہی ان کے مفادات کی ضرورت ہے اور قوم خطابت کے ماہروں کے دھوکے سے بچیں تاکہ وہ انہیں قومی نسل گروہی تعصب میں پھنسا کر تقسیم نہ کر دیں۔ اس کی تشریح 160 سال پہلے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں کی گئی تھی جو ابھی تک تبدیل نہیں ہوئے کمیونسٹوں اور پرولتاریہ کے مفادات ایک ہیں۔ مختلف ملکوں میں پرولتاریہ کی جدوجہد

کے پیش نظر ہی کمیونسٹ اپنا لائحہ عمل مرتب کریں گے وہ لانگ آف مارچ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس لئے کا ٹیڈ کیا ان کا فرض بھی اور حق بھی ہے وسیع پیمانے پر مختلف تنظیموں کی جدوجہد کے نتیجے میں ہی نئی انٹرنیشنل تشکیل پائے گی۔ بہت سی ورکرز پارٹیوں کے اندر مشوروں کے نتیجے میں ہی وہاں کمیونسٹ پارٹیاں تشکیل پا گئی تھیں جن کو مارکسزم کی پیروی کرنے پر فخر تھا۔ انڈیپینڈنٹ سوشل ڈیموکریٹس کی اکثریت جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے سرگرم کارکنوں کی تھی۔ فرنچ سوشلسٹ پارٹی جس نے اپنا نام تبدیل کر کے کمیونسٹ پارٹی رکھ لیا تھا۔ ناروے لیبر پارٹی، اٹالین سوشلسٹ پارٹی حتی کہ ٹریڈ یونین والے جیسے CGT اور ساؤتھ ویلز فیڈریشن بھی اس میں شامل تھی۔ شروع میں ناگزیر تھا کہ یہ جزوی نا مکمل اور اصلاحات پسند پروگراموں کے گرد تشکیل پائے گی۔ یونائیٹڈ فرنٹ کی حکمت عملی اور Centerism ایک بار پھر ایجنڈے پر ہوگا۔ اگر کسی ایک موجودہ سوشلسٹ گروپ کی طرف سے کیا جائے کہ وہ نئی انٹرنیشنل تشکیل دے رہے ہیں یہ سنگین بڑی بھول ہوگی۔ اس کی نشاندہی تمام تنظیموں کا بین الاقوامی اتحاد ہے کمیونسٹ گروہی سطح پر کام کرنے والوں کو مراعات نہ دیں بلکہ طبقے کے مفادات کے لئے مشترکہ جدوجہد کی حوصلہ افزائی کریں۔ سوچیں بیشک علیحدہ علیحدہ ایکشن اکٹھے کریں۔

یہی ٹراٹسکی کا بھی نقطہ نظر تھا کہ ایسی جدوجہد کی جائے جو موجودہ مطالبات کیلئے کی جانے والی جدوجہد کو انقلابی سوشلسٹ پروگرام سے آ کر ہم آہنگ کر دے۔

پلیٹ فارم یعنی دھڑا اور گروپ ہی آخر کار جمہوری طور پر اکثریت کی طرف سے تسلیم شدہ خاکہ ہوتا ہے۔ مزدور طبقے کی طرف سے کوئی بھی تحریک چلانے کیلئے بنیادی اصول ہیں۔ جمہوری روایات کی مرکزیت مدت ہوئی مسخ شدہ سوشلسٹ ریاستوں کی نوکر شاہی کے جبر کی وجہ سے بدلی ہوئی شکل کی صورت میں مدغم ہو کر رہ چکی ہے جس کو غلطی سے لینن اسٹ انقلابی پارٹی اور ٹراٹسکی کی تقلید کرنے والوں نے نام نہاد پرولتاری ڈکٹیٹر شپ سمجھا۔

ورکرز کی انٹرنیشنل کی قوت کا منبع اپنی جمہوری مرکزیت کی بجائے کھلی بحث کی اجازت ہوتا ہے۔ جو کھلی بحث سے کنی کتراتے ہیں وہ دراصل وہ مسئلہ کو ہی ختم یا دبا دیتے ہیں۔ یہ اتنی ضروری ہے جتنی انسانی جسم کیلئے آکسیجن۔ مارکسسٹ دل کی چھپی بات بتا دینے والے صاحب ولایت لوگ نہیں ہوتے نہ ان کے پاس کوئی جادوگری ہے بلکہ موجودہ حالات وعناصر کے پیچیدہ عمل کو سمجھنا نتائج تک پہنچنے کا صحیح جدلی طریقہ ہے جسے تضادات کا اتحاد، مقدار سے معیار کی طرف جانا، اختلاف کے ذریعے ترقی کا عمل، امکانات کی سائنس کے علاوہ کھلے مباحثے کے ذریعہ اصلاح جس کے نتیجے میں خیالات پر زور دیا جا سکتا ہے ان کو چیلنج کیا جا سکتا ہے درست کیا یا پھر چھوڑا جا سکتا ہے۔ ان ناگزیر محافظوں کے بغیر انتہائی واضح اصول بھی تباہ کن حد تک بودا اور بے ثبات ثابت ہو سکتا ہے۔ جب معاشرہ غیر یقینی حالات سے گزر رہا ہے تو ایسے حالات میں پیشہ یقین کر لینا نقصان دہ ہوتا ہے۔ پچھلے دو عشروں کی غیر یقینی صورتحال میں مشروط رویہ اپنانا ضروری تھا۔ بڑے بڑے واقعات وقوع پذیر ہونے

کی طرف بحث و عمل کی پیش رفت جاری ہے۔ جو کسی بڑے واقعہ کے عنقریب وقوع پذیر ہونے سے انکار کرے گا وہ ذہنی طور پر دوسروں سے پیچھے رہ جائے گا۔ ہم مربوط رابطے سے تنظیم سازی کر سکتے ہیں۔ ہم مختلف تنظیموں کے کارکنوں کو اپنی تنظیم چھوڑنے کی بجائے کہیں گے کہ وہ اپنی صفوں میں مزدور حوالے سے پیش آور حالات و واقعات اور مسائل پر سیر حاصل بحث کریں۔ مستقبل کی انٹرنیشنل کا بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہوگا جو گزشتہ غلط فہمیوں، نا امیدیوں، عادتاً وفاداریوں سے پاک ہوگا۔ بہت سے پرانے جنگ جو لوگ تھکے ہارے ہیں ان کو کئی گروہ بندی اور ماضی کی ناکامیوں کے حوالے سے رد و بدل کر کے آگے لانا مشکل ہے اکثریت بوریت کا شکار ہیں۔ تحمل کے ساتھ جدوجہد اور پر جوش خیالات رکھنے والے نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کرنا ضروری ہے مزدور طبقے کی تنظیمی اور سیاسی طور پر قیادت پہلے ہی حرکت میں ہے۔ صرف مزدور طبقے کو موجودہ تناظر کے لحاظ سے متحد و متحرک کرنا باقی ہے۔ انقلاب کے راستے کی بڑی رکاوٹ نوکر شاہی کی غداری نہیں بلکہ یہ کہ مزدور طبقہ کا اپنے آپ میں اعتماد کا فقدان ہے۔ قومی حماقتی اور سیاسی جدوجہد کو کسی مرحلے پر بھی مذاق سمجھنا تباہ کن ہے کٹر مارکسسٹ، ماضی کی روایات سے بچنے والا ایک حصہ اب بھی ہماری قابل فخر مشترکہ میراث ہے جس کا تعلیم دینے میں قابل قدر کردار ہے۔

ان کے ساتھ کام کرنے میں مسئلہ یہ ہے کہ ان میں اپنی بات کو کسی ماضی کے حوالے سے منوانے کا خراب رجحان ہے لہٰذا اپنی بہترین سوچ کے باوجود وہ اپنی گروہی سیاست کو ہر دفعہ آگے لے جاتے ہیں۔ اپنے زمانے میں کارل مارکس اور اینگلز سائنسدان کی طرح نیم حکیموں اور سانپ کا تیل بیچنے والوں کے پکے کھلے ٹھگوں کے خلاف ڈٹ گئے تھے۔ ڈیرنگ کی حماقت 11 سال کی سوشلسٹ پرستی "سیلیکو" کی مہم جوئی "باکونن" کا منتشر انداز شکست و ریخاست اس کی مثالیں ہیں۔ مزدوروں کی جدوجہد کئی مرتبہ بزدلی، سختی اور غداری کے باعث تباہ ہوئی۔ ایسا اداراتہ غلطی اور وقتی جرائم بھی اس کی وجہ سے بنے۔ دوسرے انٹرنیشنل کی اصلاحات پسندی اور کمیونسٹ نوکر شاہی دونوں ہی مزدور کا استحصال تھا۔ انقلاب کو ناکام کرنا دونوں کا مفاد تھا اور دونوں کے پاس بیشمار دولت تھی جس کی پشت پر پولیس کا آہنی نظام تھا۔ اس نوکر شاہی کی تاریخی اور اصلاحات پسندی کی مادی بنیاد دونوں ہی بری طرح کمزور ہو چکی ہیں۔ جب اینگلز نے 1989ء میں سوشلسٹ انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی تو انہوں نے پہلا کام جو کیا وہ عالمی سطح کی ایک روزہ ہڑتال منظم کرنا تھا جس سے مزدور طبقے میں اعتماد اور حکمران طبقات میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اینگلز نے فخر سے کہا "آج یورپین اور امریکن پرولتاریہ اپنی لڑاکا قوت پر نظر ثانی کر رہی ہے پہلی دفعہ حرکت میں آئی ہے ایک فوج کی طرح ایک جھنڈے کے نیچے کسی فوری مقصد کیلئے آج کا منظر نامہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی آنکھیں کھول دیگا۔ تمام ملکوں کی پرولتاریہ متحد ہے کاش مارکس میرے ساتھ یہ سب کچھ دیکھنے کیلئے موجود ہوتا"۔

اینگلز ان سوچ پرستوں اور بے وفائیوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا جو ہونے والی تھیں۔ آج ایسے حالات ہیں کہ وہ اس منزل کو پالیں، جس کے لئے سوشلسٹ نسلیں کوشش کرتی رہی ہیں۔ آئندہ جو انٹرنیشنل وجود میں آئے گی وہ نئے مزدور طبقے پر مشتمل ہوگی جس میں کروڑوں مرد وخواتین شامل ہوں گے۔ یہ تاریخ کی شاندار بہترین تحریک ہو گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکے گی۔ ایسا کرتے کرتے پورا انسانی سماج تباہ ہو جائے گا۔ اس کی تشکیل میں حصہ لینا ایک اعزاز ہوگا یعنی نئی انٹرنیشنل۔

----☆----

ماحولیاتی بحران: کرہ ارض کو کون بچا سکتا ہے؟

موسمی تبدیلی اور ماحولیاتی بربادی سرمایہ داری کے مسائل میں ھے

سرمایہ داری نظام عرصہ ہوا اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ بینک اور کارپوریشنز جو دنیا پر حکومت کرتی ہیں، انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ٹیکس ادا کرنے والوں پر اکاس بیل کی طرح ان کی کمائی پر پلتی ہیں۔ ان کی کارکردگی نے زندگی کو کرہ ارض پر خطرے میں ڈال دیا ہے۔ سوال یہ ہے کیا سرمایہ داری نظام میں اس کا کوئی حل ڈھونڈا جا سکتا ہے؟ سوشلزم ہی زندگیوں کو گزارنے کے قابل بنانے کی ضمانت دے سکتا ہے۔ کیا سوشلسٹ معاشرے کا نظریہ تخیلاتی سراب میں گم ہو گیا ہے؟ سوشلزم کیلئے نظریاتی بنیادوں کی فراوانی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ یہی فراوانی سرمایہ داری نظام کے لئے ناقابل عبور مسائل پیش کر رہی ہے۔ ان کا یہ مسئلہ ہے کہ اشیا کو صرف کرنے کے مسئلے سے کس طرح نمٹا جائے لیکن یہ مسئلہ ہمیں مسخرانہ اور نا امیدی کی حالت میں پیش کرتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہماری چاندی، پلاٹینم، انٹیمونی، زنک اور بیشتر ضروری اشیاء ختم ہونے والی ہیں۔ نئے سیاستدان کا کہنا ہے کہ سینکڑوں دھاتوں کے غیر استعمال شدہ اسٹاک ہیں۔ موجودہ مروج ٹیکنالوجی کے پیش نظر یورپ کے تمام لوگوں کا جدید ترقی یافتہ معیار زندگی قائم رکھنا ناممکن ہے۔ اس صورتحال کی وجہ سے پہلے ہی کئی جنگیں ہوئی ہیں اور افریقہ میں ایک نئی مشکل صورتحال پیدا ہوئی ہے جس لپیٹ میں چین اور دوسری سامراجی طاقتیں بھی آ گئی ہیں۔ ہمیں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی 6 ارب آبادی 2050 تک تقریباً 9 ارب تک بڑھ جائے گی جبکہ غذائی پیداوار پہلے ہی سیلاب، حیاتیاتی ایندھن وغیرہ کی وجہ سے بحران کا شکار ہے۔ تیل کے ذخائر یقیناً محدود ہیں اور اس نقطہ پر پہنچ رہے ہیں کہ مزید نکالنا اقتصادیات کیلئے نقصان دہ ہوتا جا رہا ہے۔ کسی صورت بھی ماحولیاتی آلودگی اور کرہ ارض کا گرم ہونا جس کی بڑی وجہ تیل کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہے اب اس مرحلے پر پہنچ چکا ہے کہ پیشہ ور حکومتی

اور کارپوریشنوں کے جھوٹ بولنے والے ماہرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تمام ممالک اور تمام آبادی کیلئے عالمی سطح کی عظیم تباہی لازمی ہو چکی ہے۔ جب تک ایسے تمام اخراج 1990 کی سطح کے پیش نظر 80 فیصد نہ کر دیے جائیں۔ یہ ایک تضاد ہے کہ یہ پیداوار ہی ہے جس پر سوشلزم اور انسانی بقا انحصار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ مہم دیا ہوا سرمایہ دارانہ منڈی کے بس میں نہیں ہے۔

موسمی تبدیلی اور ماحولیاتی بربادی سرمایہ داری کے مسائل میں ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف قابل تجدید توانائی یا ایک یا دوسرا ٹیکنالوجیکل متبادل نہیں، بلکہ ٹیکنالوجی، انسان اور فطرت میں آپس کے رشتہ کے حوالے سے تبدیل شدہ رویہ ہے۔ سرمایہ داری کے حوالے سے تمام فطرت کو محدود مقدار میں پارسل کی صورت دے دی گئی ہے یعنی ذرائع پیداوار اور اشیاء جن کو لوٹ لینا، بروئے کار لانا اور بیچنا مقصود ہے۔ سرمایہ دار اپنے منافع جات وغیرہ ہائیڈروکاربن کو آکسائیڈ میں تبدیل کرنے کے حقوق اور ملکیت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس عمل سے بننے والی ناقابل قبول سائیڈ پراڈکٹ CO_2 کسی اور کا مسئلہ ہے (سرمایہ دار کا نہیں) لیکن تیل کی وجہ سے جنگیں اور کرہ ارض کی تباہی کے درمیان ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہمیں لازماً خرچ یا زیادہ چاہیے مگر صرف کم کرنا چاہیے کیونکہ ہم میں بہت زیادہ تعداد ان کی ہے جنہیں کھلانا پڑتا ہے خاص طور سے بوڑھوں کی بڑی تعداد جو صرف تو کر سکتے ہیں مگر پیدا کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ جنگیں انسانی فطرت وغیرہ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

مارکسزم نے ہمیشہ فطرت کو مدنظر رکھا ہے کیونکہ یہ عمل ہمیشہ حرکت میں رہنے والا نیٹ ورک ہے جس کا انسان ایک حصہ ہیں۔ یہ بات مالتھس کے اس فرسودہ نظریہ کے جواب میں کہی گئی کہ غذائی اشیاء میں اضافہ کبھی بھی آبادی میں اضافہ کے ساتھ منطبق نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ اس نظریہ پر مبنی تھا کہ انسانی توانائیاں ایک دفعہ بے قابو ہو جائیں تو پھر وہ فطرت کی قوتوں کو متوازن کرنے کیلئے نئے راستے تلاش کر لیتی ہیں۔ یہ عمل ہم نے بمشکل ابھی شروع کیا ہے۔ اگر ہم نے طبیعیات کے بنیادی اصول غلط نہ سمجھے ہوتے تو ہمیں پتہ چلتا کہ کائنات کے اندر 95 فیصد مادہ یعنی توانائی اندھیرے میں ہے۔ مگر ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ اینگلز کے مطابق ہم لوگ معاشرتی اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ابھی زمانہ قبل از تاریخ میں ہیں۔ فطرت کی قوتیں دراصل ناقابل اختتام ذخیرہ ہیں۔ سو مربع میٹر سورج کی روشنی کے اندر اتنی توانائی موجود ہے جو انسان کی تمام توانائی کی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ فوٹو سینتھٹک اجسام سالانہ ایک کھرب ٹن کاربن کو بائیوماس میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ایک کلوگرام مادہ کے اندر اتنی توانائی ہے کہ وہ ایک کلوواٹ کے الیکٹرک ہیٹر کو 130 کھرب سال تک چلا سکتا ہے۔ ہم نے ایٹمی دھماکہ کرنا سیکھ لیا ہے اگرچہ ابھی تک ہم نے ایٹمی فضلہ ٹھکانے لگانا نہیں سیکھا۔ مستقبل میں زیادہ دور نہیں کہ ایٹمی Fission کاری توانائی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوگا۔ یہ ذرائع ختم ہو جانے کی وجہ سے نہیں ہوگا اور نہ ہی ناقابل عبور رکاوٹوں کی وجہ سے ہوگا۔ حتیٰ کہ مالا نئے سائنسدانوں کے جواب میں خطرے موصول ہوئے

جس میں کہا گیا تھا۔ "عناصر نہ ہی پیدا کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ختم کیے جا سکتے ہیں"۔ "پلاٹینم آج بھی اتنی ہی مقدار میں موجود ہے جتنی کہ قبل ازیں کسی وقت ماضی میں تھی یا جتنی مستقبل میں ہوگی"۔ یہی صورتحال کسی بھی دوسرے عنصر کے حوالے سے ہے۔ کسی بھی عنصر کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی پہلی حالت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چاہے یہاں کتنی ہو یا ری سائیکلنگ۔ ایک سائنس دان کے مضمون میں بذات خود مسئلے کے حل کے بارے میں واضح جواب موجود تھا۔

ہماری ضرورت فضلے کو کم سے کم کرنا ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکے متبادل کی تلاش کی جائے اور جتنا کو Recycle کیا جائے۔ پلاٹینم سڑک کنارے گرد و غبار کے ذرات کی صورت میں ہر ذرے کے دس لاکھ ٹکڑے کیے جائیں تو ڈیڑھ ٹکڑے کے برابر ہے۔ وہ لوگ اب اس قسم کی آبادیوں میں پلاٹینم کے بڑے بڑے ذخیرے کی تلاش میں ہیں اور بیکٹیریا کی شکل وضع کرنے کی کوشش میں ہیں جو پوری صلاحیت سے پلاٹینم کو گرد و غبار میں سے علیحدہ کر سکے۔ اقوام متحدہ کے شعبہ "فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن" کی طرف سے آبادی میں اضافے کے بارے میں غلط حوالہ دیا جاتا ہے۔ وہ خصوصاً بیان دیتے ہیں "دھماکے کی صورت میں آبادی میں مسلسل اضافے کی توقعات جھوٹ پر مبنی ہیں اور اصل دنیا تیس سال قبل ہی آبادی میں اضافے کی شرح کی انتہا کو چھو چکی ہے" وہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور تقریباً 2050ء میں شرح 9 ارب پر آ کر مستحکم ہو جائے گی۔ دنیا میں کافی مقدار میں اچھی زمین موجود ہے جو 1/2 ایکڑ فی کس حصے میں آتی ہے۔ جبکہ یہ پانچ آدمیوں کو پالنے کے لئے کافی ہے (یہ کم از کم اندازہ ہے) لیکن نجی ملکیت اور بری طرح غیر مساویانہ تقسیم ایسے حساب کو بے معنی بنا کر رکھ دیتی ہے جیسے کہ برطانیہ جیسی ترقی یافتہ جمہوریت میں تقریباً آدھی زمین پرائیویٹ خاندانوں کی ملکیت ہے۔ کل زمین کا 2/3 حصہ صرف 17 فیصد آبادی کے قبضہ میں ہے۔ انگلینڈ اور ویلز میں صرف ساڑھے بارہ فیصد زمین آبادی کے رہائشی قبضہ میں ہے۔ اس طرح 4 کروڑ 78 لاکھ لوگ صرف 34 لاکھ ایکڑ زمین پر آباد ہیں۔ دوسری 2 کروڑ 69 لاکھ ایکڑ زمین 135000 لوگوں کی ملکیت ہے "کیون کے حل" کی کتاب Who Own England ہے مگر اب نئی کتاب Who own the World آئی ہے۔ اضافی آبادی ایک تقابلی اصطلاح ہے آبادی کے حوالے سے ایسی جغرافیائی حدود ہیں جس کے مطابق مخصوص ٹیکنالوجی کے ذریعے زمین کا وہ ٹکڑا اس آبادی کو خوراک مہیا کر سکتا ہے۔ جس معاشرہ میں بھی بڑا اضافی بوجھ تصور کیا جائے یہ نسل کے ختم ہونے اور اس کی عنقریب مسماری کی طرف اشارہ ہے "پلے اولیتھک" کے زمانے بعد کسی معاشرے کی ترقی کا پیمانہ وہ ٹیکنالوجی ہے جس کو وہ معاشرہ گذشتہ حدود و قیود پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ فطرت بذات خود نہ کھسنے والی کشور اور سخت طبعی اور کیمیائی قوتوں کی مالک ہے۔ جس نے کاربن کی بنیاد پر قائم زندگی کو پیدا کیا۔ اپنی تمام صورتوں میں موجود ہے اور تقریباً آئندہ 5 ارب سال تک ان کے ختم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

جو معاشرے ان قوتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ پھلتے پھولتے ہیں۔ غذائی بحران غالباً مارکیٹنگ کا مسئلہ ہے (جیسا کہ حال ہی میں 2005ء میں WHO اضافی پیداوار کے خطرات کی وارننگ دے رہا تھا) یہ ان اقدامات کا نتیجہ ہے جو ماضی میں بچنے والے پہاڑوں کو کم کرنے کے سلسلے میں اٹھائے گئے تھے یعنی امدادی قیمتیں کم کر کے زرعی اجناس کے کاروبار کو کھلی منڈی میں لایا جائے۔ سپر مارکیٹوں میں تاجر اور سٹہ بازوں کے ذریعے غلبہ کی صورتحال پیدا کی جائے۔ جنگلات کم کیے جائیں، سرٹیفکیشن کی پابندی ختم کی جائے، زیادہ مل چلانے اور پیٹرولیم مصنوعات پر انحصار کم کیا جائے۔ گھٹیا کھادیں اور کرم کش ادویات کا کم استعمال۔ زمین کا کٹاؤ ہونے دیا یہ تمام اقدامات سٹہ بازی کیلئے فائدہ مند ہیں۔ خوف پیدا کرنے والی واحد وجہ مستقبل میں کی جانے والی سٹہ بازی تھی۔ جس کی سوچی سمجھی وجہ غذائی اجناس کے گوداموں میں کی گئی۔

سرمایہ داری نظام کی اخلاقیات صرف روپے پیسے کی حد تک محدود ہیں حقیقی اخلاقیات کا معیار بگاڑ سکتی ہیں۔ اگر سرمایہ داری پیداوار سے قبل کی کھیتی باڑی سے موازنہ کیا جائے تو صورتحال یہ تھی کہ توانائی خرچ ہونے کے حوالے سے ہر دس کلوگرام پیدا کرنے پر ایک کلوگرام خرچ آتا تھا۔ جبکہ موجودہ ضرورت سے زیادہ مشینی طریقہ پیداوار اپنانے کی وجہ سے موجودہ زرعی تجارت میں 10 کلوگرام خرچ کرنے پر ایک کلوگرام پیداوار دیتا ہے دوسرے الفاظ میں اگر کل خرچ کے حوالے سے صحیح موازنہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ دس گنا کم کفایت پر مبنی ہے۔ اس شعبہ کے تمام سنجیدہ کا مصنفین جیسے کہ "کولن ٹج" نے (کیپٹل جلد۔1) کارل مارکس کے ساتھ ملتا جلتا تبصرہ کیا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار ایسا فن ہے جس کے ذریعے نہ صرف مزدور بلکہ زمین کو بھی لوٹا جاتا ہے۔ محدود مدت تک زمین کی زرخیزی بڑھانے کے سلسلے میں تمام ترقی دراصل ہمیشہ باقی رہنے والی زرخیزی کے ذرائع کی بربادی پر منتج ہے۔ آج زیادہ سے زیادہ لوگ مارکس کے نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں (کیپٹل جلد۔ 3) سرمایہ دارانہ زرعی پیداوار کے طریقے معقول زراعت کے منافی ہیں یا یہ کہ سرمایہ دارانہ طریقہ معقول زراعت سے میل نہیں کھاتا۔ اگرچہ موخر الذکر (سرمایہ دارانہ طریقہ) طریقہ زراعت میں تکنیکی ترقی کو متعارف کراتا ہے مگر اس میں چھوٹے کسان کے ہاتھ کی ضرورت ہے جو اپنی محنت کے بل پر زندہ ہے یا پھر اس عمل پر ایسوسی ایٹ پروڈیوسرز کا کنٹرول ہو۔ روشن خیال زراعت موجودہ انسانی وسائل کو بیشتر نسلوں کے حاصل کردہ علم اور موجودہ سائنسی ترقی کو ساتھ ملا کر مسلسل کوشش کے ذریعے پیداوار بڑھانے کی کوشش کرے گی۔ نوآبادیاتی زمانے کے مشینی طریقہ زراعت کی نسبت آج کا سائنسی طریقہ زراعت زیادہ ناقص ہے۔ یہ موجود قدرتی وسائل اور مستقبل بعید میں پیدا ہونے والے نتائج کا جدلی اشتراک عمل کے حوالے سے موقف نہ کرتا ہے۔ شعبہ زراعت کے حوالے سے ایسی سوچ کے ذریعے مختلف لوگ مختلف نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ قابل کاشت زمین پر جنگلات اور چراگاہی زراعت یا وسیع پیمانے پر گندم اور چاول کی کاشت سے لیکر چھوٹے پیمانے پر درخت اور جنگلات اگانے

کے دیہی پراجیکٹس کے حوالے سے بھی ایسی سوچ سے مختلف لوگ مختلف نتائج اخذ کر سکتے ہیں جو ختم شدہ مائیکرو غذائیت کو بحال کر کے پودوں کی کثرت کی غذائیت کی ضمانت دے سکتی ہے بہ نسبت زیادہ گوشت کی پیداوار کے جو انسانی غذائیت کی اضافی ضرورت کو بھی پورا کرے۔ یہ غذائی ضرورت جو انسان نے دس لاکھ سال کے عرصہ ارتقاء میں محسوس کی ہے۔ (آج بھی جیسا کہ کچن کے حوالے سے دنیا کی روایات ہیں)

تیل

قدیم سرمایہ داری نظام کی فطرت کو تیل سے زیادہ اچھی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کوئلے نے انقلاب کو قوت بخشی اور تیل اس کو بلند ترین سطح پر لے آیا۔ تیل اپنے مختصر دورانیے کے باوجود انسانیت پر ناقابل بیان مصیبتوں کا باعث بنا ہے۔ یہ دنیا پر اقتصادی اور فوجی غلبہ حاصل کرنے کی ترکیب ہے۔ یہ ملٹی نیشنل، فوجی سراغرسانی اور صنعت کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ گزشتہ دو عالمی جنگوں کی جڑ رہا ہے اور بیشمار چھوٹی چھوٹی جنگوں اور سامراجی احمقانہ مہم جوئی، افراط زر اور اقتصادی تباہی کی آج تک وجہ رہی ہے۔ حیاتیاتی ایندھن کے متبادل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ سائنس سے متعلق ہر رسالے کے ہر شمارے نے کاربن کم کرنے کے حوالے سے پیش رفت کی۔ متبادل طریقوں سے بجلی پیدا کرنے کی کئی نئی رپورٹیں ہوتی ہیں ایسی کاریں جو کمپریسڈ ہوا سے چلتی ہیں۔ انتہائی تیزی سے چارجنگ کرنے والی بیٹریاں، ایندھن اور کھاد وغیرہ کی سمندری بیج کے متعلق رپورٹیں بھی ہوتی ہیں لیکن ہر آنے والا دن ثابت کرتا ہے کہ مسائل کا حل ٹیکنالوجی میں نہیں بلکہ سوشل سسٹم کی صلاحیت میں ہے کہ وہ اسے کس طرح منظم کرتا ہے۔ تمام دنیا میں پھیلا ہوا انفراسٹرکچر اور صنعتوں کا ایک طاقتور سلسلہ تیل ہی کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ حال ہی میں بجلی سے چلنے والے ویہکل کو ایک جگہ ڈھیر کر کے کرش کر دیا گیا کیونکہ انہیں موجودہ سسٹم کی بقاء کے لئے حقیقی خطرہ سمجھا گیا۔ تیل کی بلندی کی طرف جاتی قیمتیں یا کسی موسمیاتی تبدیلیوں نے ابھی یہ تجویز دینی شروع نہیں کی کہ یہی متبادل ہیں (مذکورہ بجلی کے ویہکل) جن کے ذریعے ان کی بقاء اور مسلسل منافع کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ نے کبھی بھی بامعلاحیت پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم جس کے معاشرے کو فوائد ملیں، پر غور نہیں کیا۔ اس طرح کے فوائد کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا دبا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سوال کہ نجی منافع خوری کی بنیاد پر استوار نظام اس قابل ہے کہ توانائی بہم پہنچانے کا اس طرح انتظام کرے جو تمام نظام اور آنے والی نسلوں کی ضروریات بھی پوری کرنے کا اہل ہو۔ یہی فیصلہ کن نقطہ ہونا چاہیے۔ کئی قسم کے ماحولیاتی شعبے ہیں (جارج مونبیٹ گوڈال اور ڈیوڈ کنگ کی لکھی ہوئی کتابیں) جو کرۂ ارض پر موسمیاتی تبدیلیوں کا حل پیش کرتی ہیں جن کی بنیاد ثابت شدہ ہے یا فوری طور پر اختلاط سے قابل عمل بنایا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹے پیمانے پر پوری دنیا میں ہو سکتا ہے (کچھ وسیع پیمانے پر بھی)۔ مسئلہ اس بارے میں نہیں مخصوص حل سے معمولی اختلاف سے کہ یہ حل موثر انداز ہے یا نہیں، اس سے

قطع نظر اتفاق وسیع تر تناظر میں اس پر اتفاق ہے۔ مثال کے طور پر کہ افریقہ کی توانائی کی تمام ضرورتوں کے پیش نظر شمالی افریقہ کے صحرا 43 فیصد جدید CSP پینل کے استعمال سے افریقہ، مشرق وسطی اور یورپ کی توانائی کی تمام ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ ایسا ہی الیکٹرک گرڈ اسٹیشن سٹور کرنے کے علاوہ پانی والی زیر سمندر کیبل کے ذریعے ہوا والی ٹربائنوں سے پیدا کردہ بجلی برطانیہ اور سکنڈے نیویا کے ذریعے بہم پہنچایا سکتا ہے۔ جیرمن کی تجزیری اور Home unsulation and emission اور مشترکہ حرارت اور بجلی پیدا کرنے کے پلانٹ Neutral housing کاربن کو قابو کرنے اور سٹور کرنے، جنگلات دوبارہ اگانے یا جنگلات ختم کرنے کے خلاف عمل Cellulose (ایک قسم کا مسالہ) سے مسلسل ایندھن بنانے کے علاوہ بہت کچھ کے بارے میں سرمایہ دار اتفاق کرتے ہیں۔ ان سے اخذ کردہ نتائج میں سے کوئی بھی سرمایہ داری نظام کے فائدہ پہنچانے کے بارے کوئی سوال نہیں اٹھاتا۔ اس کے برعکس سرمایہ دار شاید بہت بڑے کاروبار کے سلسلہ کی بات کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کاروباری رسالہ نے Nickinsey Quartaly نے 2007ء میں پیشگی کیا کہ گرین ہاؤسز میں گیس کو کم کرنے پر اخراجات کے اوپر ایک حد مقرر ہے جو دوسری متبادل پیش کرتی ہے۔ یہ تمام متبادل اگر پوری صلاحیت سے بروئے کار لائے جائیں تو ان اخراجات کا 2030ء تک عالمی جی ڈی پی کا 0.46 فیصد اندازہ شمار کیا گیا ہے۔ 54.62 ٹریلین ڈالر 2007ء کے اندازوں کے مطابق) اگر کم صلاحیت دکھائی گئی تو 1.44 فیصد سے زیادہ نہ ہوگا جو امریکیوں کیلئے 1.8 فیصد ہوگا (یہ دنیا کے چوٹی کے 100 ارب پتیوں کی دولت کے برابر ہے یا امریکہ کا عراق افغانستان جنگ پر خرچ ہے) لیکن اس سرمایہ کاری پر فوری منافع نہیں ہوگا بلکہ منافع کی ضمانت نہیں ہے۔ اس کے فوائد بالآخر ان لوگوں پر خرچ کئے جائیں گے جو موثر ڈیمانڈ پیدا نہیں کر سکتے یا حال کی ان نسلوں کیلئے رکھے جائیں گے جو مستقبل میں کچھ کر نہیں سکتے۔ موسمی تبدیلی کی تشریح یوں کی گئی ہے "یہ عظیم ناکامی ہے جو دنیا نے کبھی بھی دیکھی ہو"۔ کچھ نے کاربن دھواں چھوڑنے پر ٹیکس لگانے کی تجویز دی جو ایسا ٹیکس لگانے پر راضی تھے وہ کسی قسم کے معاہدہ پر متفق نہ ہو سکے اور معاملہ لٹک کر رہ گیا۔ یونیورسل ٹیکس لگانے میں ناکامی عالمی حکومت بنانے کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے سوچا نہیں جا سکتا۔ گلوبل معاہدے اور ٹارگٹ کے باوجود کاربن کا سالانہ اخراج 2000ء اور 2007ء کے درمیان 1990ء میں کئے گئے اندازے سے 4 گنا زیادہ ہے۔ ان سودوں کی تشہیر انٹرنیٹ پر ہوتی ہے جو خبر وغیرہ "یا نان" کی آخری میٹنگ میں اس کاروبار کے سلسلہ میں پرجوش کوششیں یہاں تک تیار ہو گئی تھیں کہ جنگلات کو کم کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں کہ کوئی فائدہ اٹھا سکے (اگرچہ ایسا ہو نہیں سکا) ایسے فنڈ کے لئے بھی تیار تھے جو گلوبل گرمی کی صورت غریب ملکوں کی مدد کرے۔ اس ضمن میں سمندر کا چڑھنا، سیلاب، قحط سالی، طوفان، جنگلی آگ یہ سب کاروبار بھی شامل تھے۔ اس اجلاس میں شامل ایک بڑے نے کہا کہ 2009ء میں عمل کرنے کے لئے ہم نے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ قابل غور ہے کہ 10,30 ارب ڈالر

میں سے دنیا کی 17فیصد آبادی کو پینے کا صاف پانی مہیا ہو سکتا ہے۔ ایک حالیہ سروے سے معلوم ہوا کہ برٹش طاقت UK کے 83فیصد بزنس کی اکثریت نے کہا ہے CO2 کا 2050ء تک اخراج 80فیصد تک ہو جانا غیر حقیقی ہے۔ صرف 31فیصد کا خیال ہے کہ گیسوں کا اخراج روکنا بھی اچھے کاروبار کے مواقع پیدا کر سکتا ہے۔ 97فیصد نے کہا ہے کہ فی الحال ان کی گیسوں کے اخراج کو روکنے کی بجائے دوسری چیزوں پر آنے والے اخراج کم کرنے پر توجہ زیادہ ہے۔ کرہ ارض پر ہمارا معاشرہ پہلا نہیں ہوگا جس نے اپنا ماحول تباہ کیا۔ وسائل ختم کئے پھر کہیں اور چلے گئے یا ختم ہو گئے۔ برف کے زمانہ کے شکاریوں نے ضرورت سے زائد شکار کیا جس پر ان کا گزارہ تھا پھر کہیں اور چلے گئے۔ سرمایہ داری نے کرہ ارض کو پہلے ہی گھیرا ہوا ہے گنجائش ہی نہیں کہ انسان کہیں اور چلے جائیں۔

تمام ماہرین متفق ہیں کہ ہمیں تیزی سے عمل کرنا چاہیے جو کچھ یہ پوچھتا ہے ہم وہ کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں کیا نہ کر کے ہم گزارہ کر سکتے ہیں؟ "ہم" کا لفظ استعمال کر کے انہوں نے جمہوریت کی نئی جہت کو قبول کر لیا ہے بلکہ خیال ہے ایسا پہلے ہی ہو چکا ہے ہم اپنے آپ سے سوال کریں کہ ہم سے مراد کون ہے اور وہ کون ہے جس کی عمل کرنے کی اب باری ہے؟

کرہ ارض کو کون بچا سکتا ہے

انہوں نے اپنے مختلف طریقے سے منصوبے بنائے ہیں کہ کون سے تحت اقدامات ہیں جن سے تہذیب انسانی کو بچایا جا سکتا ہے یہ اپنے علم سے زیادہ نظام کی حدود کو ٹیسٹ کر رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جو اقدامات وہ نظام کو بچانے کے لئے اٹھائیں وہی ان کی زندہ رہنے کی قوت کو چھین لیں۔ پہلے ہی 2004ء میں 0.4فیصد آبادی کے پاس دنیا کے 25فیصد اثاثے تھے جن لوگوں کا مقصد ہی منافع حاصل کرنا ہے کسی بھی سائنس یا علم کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ دنیا کی آبادی کے بقیہ 99.487فیصد ان کے گاہکوں حریفوں یا کارکنوں کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتے، جو نظام انفرادی منافع خوری کی بنیادوں پر استوار ہو اس میں پیدا کرنے اور وصولی کرنے والی صنعت ہی الگ تھی ہے لہٰذا اس کے لئے عالمی سطح کا وسیع انفراسٹرکچر لگایا گیا جس نے دنیا کی ہیئت بدل دی بلکہ ٹیکنالوجی بھی جو منافع کی شکل میں انسانی تہذیب کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے آج دنیا میں جتنے سائنسدان زندہ سلامت ہیں وہ پہلے انسانی تہذیب میں شاید کبھی بھی نہ تھے۔ منافع خوری پہلی کبھی اپنی تکمیل کر ہی نہیں سکتا بلکہ یہ تو انسانی بقا تک کو محفوظ نہیں کر سکتا۔ اب اگر سرمایہ داری کو کہا جائے ہمیں اس گندگی سے نکالے جس میں اس نے ہمیں لا کھڑا کیا۔ یہ اس کے لئے ناممکن ہے کہ اس نے کبھی ایسا سوچا تک نہیں ہوگا۔ یہ ثابت ہے کہ ٹیکنالوجی کی بیشتر اقسام وسائل سے زیادہ سے زیادہ منافع نکالنے کیلئے ہیں۔ کرہ ارض کو گرم کرنے کا عمل

تباہ کن ترین ہے۔ اب دنیا کی تمام اقسام کی ٹیکنالوجی کو کام میں لا کر اس عمل کو روکا جائے اور فوری عملی اقدامات ہونے چاہئیں۔ مشترکہ مرکزی پلان بنانا ضروری ہے۔ اس سمت میں کچھ اقدامات مگر ناکافی اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔ اتنا وسیع پلان قوموں کی حدود سے ماورا جس کا پہلے تصور نہ ہوگا۔ منافع خوری نے پہلے ہی دنیا کو تاراج کیا ہے اس کام میں سرمایہ کون لگائے۔ سرمایہ داری نظام میں کمپنیاں خود Bail-Out کے چکر میں پھنسی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ تمام موجود علم، قوت، عمل، ہنر، تخیل اور وہ کروڑوں انسان جن کو منافع خوری کا لالچ نہ ہے یہ وہ محنت کش طبقہ ہے جو کرہ ارض کو تباہی سے بچائے گا۔ سرمایہ دار طبقہ مستقبل کے ساتھ نہیں یہ اب ہمارے لئے مستقل خطرہ ہے۔ بورژوازی کی سائنس تو ہم پرستی ہے اور ہمیں Chickon-Lickon کی کہانیاں سنا کر لوٹتا چلا آ رہا ہے۔ جو ثابت کرتا ہے کہ "انسانی جبلی طور پر جنگوں کی طرف مائل ہے تشدد پسند ہے یا یہ کہ طبقاتی تفریق داخلی بناوٹ ہے۔ مجرم پیدائشی طور ہوتے ہیں ہم زیادہ خرچ کرنے کی طرف مائل ہوتے اور زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں تبھی دنیا تباہی کے کنارے پہنچ گئی ہے" ضمیر فروشی حالانکہ سرمایہ داری کی وجہ سے ہے اور مذکورہ دلیل اس زمانے کی گھٹیا ترین بے ہودگی اور بیہودہ ہے۔ اینگلز نے جس طرح ہیگل کے جملوں کی تشریح کی ہے "انسانی تاریخ کے دائرے میں جو بھی حقیقی ہے تاریخ کے جبر میں وہ غیر معقول ہو جاتا ہے لہٰذا اپنی آخری منزل کے اعتبار سے غیر معقول ہو جاتا ہے اور ابتدائی وقت سے ہی نامعقولیت سے دوچار ہے۔ ہر وہ چیز جس کی حیثیت انسانوں کے دماغ میں معقول ہے وہ آخر کار حقیقت کا روپ دھار لے گی اگرچہ وہ موجودہ نظر آنے والی حقیقت سے کتنی ہی متضاد کیوں نہ ہو۔

"غیر معقول سرمایہ داری نظام اس وقت ترقی پسند جدید جدلی مادی سائنس کے ساتھ دست و گریبان ہے۔ یہ ضروری ہے کہ معقولیت کا ادراک اور فیصلہ وہی طبقہ کر سکتا ہے جو اپنے تخیل کو حقیقت میں بدل سکتا ہے وہ محنت کش طبقہ ہے۔ ماضی کی دوری کی ہو ونگ یعنی سوشلزم آج ہمیشہ کی نسبت زیادہ قریب ہے۔

----☆----

عورتوں کی جدوجہد

عورتوں پر جبر کرنا ہمیشہ طبقاتی جبر کا ہتھیار رہا ہے

ترقی پذیر ملکوں میں برآمدی مال کی 60فیصد سے 80فیصد پیداوار عورتیں تیار کرتی ہیں۔ یہ عورتیں ایک ڈالر یومیہ یا اس سے بھی کم پر گزر اوقات کرتی ہیں۔ عورتوں کو موجودہ دور میں مزدور مانا جاتا ہے لہٰذا کم ترین سطح پر بھی لیبر قوانین کا عورتوں پر اطلاق نہیں کیا جاتا۔ پوری دنیا میں ٹیکسٹائل اور دوسری صنعتوں میں عورتوں کو بھرتی

کیا جاتا ہے جو مردوں سے کم تنخواہ پاتی ہیں اور ان کا بے تحاشا استحصال کیا جاتا ہے۔ سوچے سمجھے انداز سے عورتوں سے اس طرح کام لیا جاتا ہے کہ یہ ورک فورس چند سال میں موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ عالمی بینک کی پیش گوئی ہے کہ قرضوں کی وجہ سے بدحالی کے سبب 28 لاکھ لوگ 2015ء تک موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ عالمی بینک کا کہنا ہے کہ جی ڈی پی میں کمی کے باعث بچوں میں لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کو اس سے بھی زیادہ تعداد کو ہلاکت کا سامنا ہے۔ دوسرے ذرائع مثلاً OXFAM نے دل دہلا دینے والی معلومات اکٹھی کی ہیں۔ دنیا میں 70 فیصد سے زیادہ غریبوں کی تعداد عورتوں کی ہے اور دنیا میں ان پڑھوں کی دو تہائی سے زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔ 15 سے 44 سال عمر کی عورتوں کی موت اور معذوری کی بڑی وجہ ان پر کیا جانے والا تشدد ہے۔ عورتیں مردوں سے نصف معاوضہ کماتی ہیں حتیٰ کہ برطانیہ میں بھی ایک جیسا کام کرنے کا معاوضہ عورتوں کو مردوں کی نسبت کم ملتا ہے۔

بچے کو جنم دینے کا مرحلہ خطرناک ترین تصور ہوتا ہے۔ زچگی کے دوران اموات شاذ و نادر ہونی چاہئیں۔ عورتوں کو صحت کے معاملے میں نظرانداز کرنا یا طبی سہولتوں تک عورتوں کی رسائی نہ ہونے کی وجہ سے موت واقع ہو جانا بہت سے ملکوں میں عام سی بات ہے۔ بہت سے ملکوں میں روایتی دائیوں کی کثیر تعداد کو ختم کر دیا گیا ہے مگر عورتوں کیلئے جدید دوائیاں روک دی گئی ہیں جبکہ اس کا کوئی بھی متبادل نہیں رکھا گیا۔ بطور ورکر، گھریلو کارکن اور بطور بچہ پیدا کرنے والی عورتوں کا کئی طرح سے دوگنا استحصال کیا جاتا ہے۔ عورتوں سے یہ امید کی جاتی ہے جہاں وہ کمانے نکلیں تو بچوں کی پرورش بھی کریں۔ بیمار اور عمر رسیدہ رشتہ داروں کی تیمارداری بھی کریں۔ کئی اسلامی ممالک میں جبر کی ایک لہر اٹھ کھڑی ہوئی ہے جو طالبان کی قدامت پسند پالیسی کی صورت ظاہر ہوئی جو کٹر مذہبی احکام کا روپ دھار چکی ہے۔ لباس اور زندگی گزارنے کے طریقے پر مذہب کے حوالے سے پابندی لگانا دراصل جمہوری حقوق پر حملہ ہے۔ عورتوں پر جبر کرنا ہمیشہ طبقاتی جبر کا ہتھیار رہا ہے۔ سوچ سمجھ کر جنگی ہتھیار کے طور پر عورتوں کی عصمت دری خصوصاً موجودہ دہائیوں میں افریقہ اور بلقان ریاستوں میں ایک دل دہلا دینے والی مثال ہے۔ تاریخی لحاظ سے جبر کی قوتوں کا مقابلہ جبر ہی کی قوتوں سے کیا گیا ہے جس میں کچھ کامیاب ہوئے اور کچھ شکست کھا گئے (یعنی دونوں طرف سے عورتوں پر ہی یہ ظلم ہوا)۔ پاکستانی عورت کی مدافعت دیکھنے کے قابل ہے جس کی ہر عورت کو مکمل حمایت کرنی چاہیے۔ وینزویلا کی عورتیں بھی جدوجہد کرنے کیلئے تیار ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ عورتیں اپنی اور اپنے خاندانوں کی بہتر زندگی گزارنے کی جدوجہد میں ہراول دستہ رہی ہیں اور ان کی جدوجہد کو ثانوی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ عورتوں نے سترھویں اور بیسویں صدی کے تمام بڑے انقلابوں میں کردار ادا کیا ہے مگر تاریخ میں ان کے اس کردار کو ہمیشہ چھپا دیا گیا ہے۔ ریاست میساچوسٹس میں ٹیکسٹائل کی صنعت میں انیسویں صدی کی عورت کی جدوجہد ولیسی تھی اور امریکی عورتوں کی حیرت انگیز جدوجہد تھی۔

"مدر جونز" انیسویں صدی کے آخر میں کان کنوں کو متحد کرنے کے حوالے سے 90 برس کی عمر میں جیل گئیں۔ بکھری ہوئی عورت ورکروں کو متحد کرنے میں مارکسسٹوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے خصوصاً اس وقت روایتی ٹریڈ یونین سازی کرنے والے ان مزدوروں سے زیادہ توقعات نہیں رکھتے تھے جن کا بے تحاشا استحصال کیا گیا تھا۔ متحد ورکرز کی جدوجہد نے عورتوں کے لئے ووٹ کا حق حاصل کرنے کی جدوجہد کے حوالے سے کردار ادا کیا۔ 1960ء میں فورڈ کمپنی میں کام کرنے والی ورکر عورتوں نے ایک لمبی تکلیف دہ جدوجہد کی کہ ان کو مردوں کے برابر معاوضہ ملے جس میں عورتوں کو کامیابی ہوئی۔ 1970ء میں گرن وک کی برطانوی ایشیائی عورت ورکروں کی لڑائی ٹریڈ یونین کے حوالے سے اٹھنے والی پہلی لہر تھی۔

کمیونٹی کو متحد کرنے میں عورتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں جو عموماً صنعتی ٹریڈ یونین جدوجہد کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ ایسی عورتیں سرمایہ داری نظام کو چیلنج کریں گی کیونکہ اس میں ان کو اپنے لئے اپنی فیملی اور کمیونٹی کیلئے کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ عورتوں کی کام کرنے کی جگہوں اور سوسائٹی میں ان کے مقام سے متعلق ایک نئے احساس نے فیصلہ کن حد تک توازن طاقت تبدیل کر دیا ہے۔

----☆----

پاکستان کی سیاسی، معاشی اور سماجی صورتحال

لیبر پارٹی پاکستان کی پانچویں قومی کانگریس ایک ایسے موقع پر منعقد کی جارہی ہے جب پاکستانی ریاست کے اندر موجود تضادات اور بحرانات زیادہ کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ صوبہ سرحد میں طالبانائزیشن کے خاتمے کے نام پر امریکی سامراج پورے ملک میں عملی طور پر اپنا خفیہ نیٹ ورک قائم کر چکا ہے۔ بلوچستان میں آزادی کی تحریک تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ملکی معیشت اور سیاست پر سامراجی مقاصد کے تابع آچکی ہے۔ دائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کے پاس سامراج کی جی حضوری کر کے اقتدار حاصل کرنے اور اقتدار میں رہنے کے علاوہ عوام کو دینے کے لئے کوئی ایجنڈا نہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کو دو سال کا عرصہ پورا ہونے والا ہے۔ فروری 2008ء کے انتخابات کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والی یہ حکومت انتہائی مختصر عرصے میں عوام میں بہت زیادہ غیر مقبول ہو چکی ہے۔ حکومت کی پالیسیوں نے عوام کو مہنگائی، بیروزگاری، غربت اور بڑھتی ہوئی طبقاتی تفریق کے سوا کچھ نہیں دیا۔ مشرف کا آٹھ سالہ دور بھرپور سامراجی حمایت میں گزرا۔ امریکی سامراج نے مشرف آمریت کے ذریعے اپنے معاشی و سیاسی مقاصد حاصل کرنے کیلئے جو حکمت عملی ترتیب دی تھی وہ مشرف آمریت کے خاتمے کے باوجود بھی جاری ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی، ایم کیو ایم، جمعیت علمائے اسلام اور اے این پی کی مخلوط حکومت مشرف سے دو ہاتھ آگے بڑھ کر سامراجی مقاصد پورے کر رہی ہے۔ مذہبی بنیاد پرستی کے ابھار کے خلاف اور دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر جنگ ہو یا اس جنگ کے پس پشت سامراجی معاشی مقاصد کی تکمیل ہو، حکمران طبقہ دل و جان سے سامراجی وفاداریوں کا ثبوت دے رہا ہے۔ پاکستان کی معیشت اور سیاست کو تیزی کیساتھ سامراجی ایجنڈے کیساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ سرد جنگ کے دور میں تیار کی جانے والی حکمت عملی جس کے تحت پاکستان کے حکمران سوویت یونین کے خلاف امریکی پارٹنرز کے طور پر فرنٹ لائن اسٹیٹ کا کردار ادا کرتے رہے جس کے نتائج آج طالبانائزیشن، مذہبی انتہاپسندی، خودکش دھماکوں اور معاشی تباہی کی صورت میں سامنے آرہے ہیں۔

پاکستان اس وقت جس معاشی، سیاسی اور سماجی بحران کی لپیٹ میں ہے اس کی جڑیں موجودہ سرمایہ داری نظام میں پیوست ہیں۔ موجودہ سرمایہ داری نظام کا استحصال جہاں عروج پر ہے وہیں معاشی زوال بھی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ پاکستان کی معیشت کا زیادہ تر انحصار ملکی پیداوار کے بجائے عالمی امداد پر ہے اس لیے عالمی سطح پر ہونے والی کوئی بھی تبدیلی پاکستان کی صورتحال پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ مشرف کے آٹھ سالہ آمرانہ دور کے خاتمے اور نئے الیکشن کے نتیجے میں بننے والی پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت سے عوام کو بے شمار توقعات وابستہ تھیں۔

لیکن زرداری کی قیادت میں چلنے والی پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت لوگوں کی توقعات پوری کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے بعد معاشی بحران نے مزید گھمبیر صورتحال اختیار کی ہے۔ موجودہ حکومت نہ صرف مشرف حکومت کی تمام عالمی سامراجی معاشی و سیاسی پالیسیوں پر عمل پیرا ہے بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر سامراج نوازی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نیولبرل ازم گلوبلائزیشن اور پرائیویٹائزیشن کی وجہ سے نہ صرف مہنگائی، بیروزگاری اور غربت میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے بلکہ طبقاتی تفریق بڑھنے اور معاشی استحصال کے نتیجے میں بہت سارے معاشرتی جرائم بھی بڑھ گئے ہیں۔

پیپلز پارٹی کی قیادت نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے تمام وعدوں سے انحراف کرتے ہوئے پارٹی منشور کے بالکل برعکس عوام دشمن ایجنڈے پر کام جاری رکھا ہوا ہے۔ پاکستان کے اقتصادی حالات بگڑنے کے سب سے زیادہ منفی اثرات محنت کش طبقے پر پڑ رہے ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں بیروزگار ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رہی سہی کسر بجلی کے بحران نے نکال دی ہے جس کی وجہ سے ٹیکسٹائل کی صنعت سمیت بہت ساری دیگر صنعتیں بڑی تعداد میں بند ہو چکی ہیں۔ پاکستان کی موجودہ صورتحال کا اگر بغور تجزیہ کیا جائے تو ملک اس وقت انتہائی گھمبیر صورتحال سے گزر رہا ہے۔ صوبہ پختونخواہ اور بلوچستان میں فوجی آپریشن جاری ہے جس کے نتائج پورے ملک میں نظر آرہے ہیں۔ ملک کا کوئی بھی حصہ خودکش حملوں اور طالبانائزیشن کے خوف سے محفوظ نہیں ہے۔ بلوچستان میں فوجی آپریشن اور قومی سوال کو حل نہ کرنے کی وجہ سے بلوچی عوام کی احساس محرومی میں جس تیزی سے اضافہ ہوا ہے اس کے بھرپور اثرات اب سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ بلوچستان لبریشن آرمی کی طرف سے کی جانے والی بہت ساری مسلح کارروائیاں اسی احساس محرومی کا واضح اظہار ہیں۔ بلوچستان کے مسئلے کو قومی سوال کے تناظر میں حل کرنے کی بجائے وہاں کی قوم پرست لیڈرشپ کا قتل عام پاکستانی ریاست کے جابرانہ ہتھکنڈوں کا اظہار ہے۔ اسی طرح صوبہ پختونخواہ کی صورتحال بلوچستان سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہو چکی ہے۔ طالبان نے صوبے کے ایک بڑے حصے پر نہ صرف قبضہ کیا ہوا ہے بلکہ ریاست کے اندر ریاست کے تصور کو عملی شکل دی جا چکی ہے۔ سوات اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر شرعی نظام کا نفاذ اور پورے ملک میں چلنے والے قوانین کے متبادل قوانین کا نفاذ موجودہ حکومت کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔ جس کی بڑی ذمہ داری اے این پی اور پیپلز پارٹی کی قیادت پر ہے جنہوں نے صوفی محمد کے ساتھ سوات معاہدہ کر کے طالبانائزیشن کو مزید طاقتور کیا ہے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں طالبان کے خودساختہ اسلامی شرعی نظام کو درست ہونے کا نہ صرف جواز ملا بلکہ حکومت کی ناکامی کا پہلو بھی کھل کر سامنے آیا ہے۔ سوات سمیت صوبہ سرحد کا بہت بڑا حصہ اب عالمی سامراجی جنگ کا گڑھ بنا ہوا ہے اور افغانستان کی طرح یہ تمام علاقے بھی مستقل بنیادوں پر طالبان اور فوج کے درمیان لڑائی کے لیے میدان جنگ بنے ہوئے ہیں۔ امریکہ اور اس کے اتحادی کا سامراجی ممالک اس ریجن کو دنیا کا سب سے زیادہ خطرناک علاقہ قرار دے

رہے ہیں۔ سوات کے حالات اقتصادی، سیاسی اور سماجی اثرات پورے ملک پر پڑ رہے ہیں کیونکہ ٹورزم کی صنعت مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے اس کے علاوہ آئے دن کے فوجی آپریشنوں اور طالبان کے حملوں کی وجہ سے ہزاروں لوگ نقل مکانی کر کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو رہے ہیں جس کے بھرپور معاشی و سماجی اثرات سامنے آرہے ہیں۔ جبکہ خودکش حملوں میں اضافے سے پورا ملک عدم تحفظ کا شکار ہو چکا ہے۔ مشرف حکومت نے اس مسئلے کا حل فوجی آپریشن میں ڈھونڈا تھا جبکہ موجودہ حکمرانوں نے صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت کے ساتھ معاہدہ کر کے ان کو اخلاقی جواز بھی فراہم کر دیا ہے۔ گزشتہ تیس سال میں پاکستانی فوج نے سامراج نوازی اور ڈالر کے حصول کیلئے جس جہادی انڈسٹری کو پروان چڑھایا تھا وہ اب ایک تناور درخت بن چکا ہے اور اس کی جڑیں پورے سماج میں پیوست ہو چکی ہیں۔ بیروزگار نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کا روزگار جہادی انڈسٹری اور مدرسوں سے وابستہ ہو چکا ہے جو بنیاد پرست کی جڑیں سماجی ناہمواری، معاشی استحصال اور غربت نے عام لوگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے گزر اوقات کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کریں۔ جو طالبانائزیشن کی بڑھتی ہوئی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

پاکستانی ریاست اس مسئلے کو حل کرنے کی بجائے مزید گھمبیر اس لیے بھی بنا رہی ہے کہ حکمرانوں کی عیاشیوں کا ایک بڑا ذریعہ دہشت گردی کے خلاف ہونے والی جنگ کے نام پر دی جانے والی عالمی معاشی امداد ہے لیکن دوسری طرف حکمران اس سے بالکل بے خبر ہیں کہ آہستہ آہستہ طالبانائزیشن کے سماجی اثرات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تقریباً ہر جگہ ایسے بنیاد پرست نظریات کا فروغ ہوتا جا رہا ہے۔ جس کے بھرپور سماجی اور سیاسی اثرات تیزی سے سامنے آ چکے ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا مستقبل موجودہ حالات میں ایک سوالیہ نشان بن چکا ہے کیونکہ پیپلز پارٹی کو اس وقت جن چیلنجز کا سامنا تھا وہ کسی کو بھی حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اقتصادی بدحالی کا خاتمہ، امن وامان کی بحالی، سیاسی استحکام اور بلوچستان کے مسائل کا حل پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں کے لیے ایک بڑا چیلنج تھا لیکن ابھی تک کی صورتحال میں پیپلز پارٹی کی حکومت کسی بھی حوالے سے عوام کو مطمئن کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی ہے جس کی وجہ سے اس حکومت کی عوامی پذیرائی کا گراف بہت زیادہ گر چکا ہے۔ دوسری سیاسی پارٹی پاکستان مسلم لیگ نواز پاپولر نعرے بازی کے نتیجے میں کسی حد تک طاقتور ہوئی ہے جبکہ جماعت اسلامی اور عمران خان جیسی کٹر رجعت مذہبی و سیاسی پارٹیاں بھی سامراج مخالف ریڈیکل نعرے بازی کے نتیجے میں عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔

حالات اس قدر گھمبیر ہو چکے ہیں کہ ریاست کے پاس اب عوام کو دینے کیلئے کچھ بھی نہیں بچا۔ حقیقی اقتصادی ترقی میں کمی کی وجہ سے صرف اور صرف عالمی امداد پر انحصار کیا جا رہا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی امداد کے نتیجے میں آنے والی دولت کا ایک بڑا حصہ فوجی و سول بیوروکریسی کی نذر ہو رہا ہے۔ موجودہ کرپٹ سسٹم میں عوام کی

حقیقی خوشحالی اور ملک کی اقتصادی ترقی ممکن نہیں ایسی صورتحال میں پیپلز پارٹی کی حکومت کا مستقبل یقیناً عالمی حمایت اور ملکی سیاسی صورتحال پر منحصر ہے۔ چیف جسٹس افتخار چوہدری کی بحالی کے بعد اس حکومت کو کسی حد تک مزید ٹائم مل گیا تھا لیکن حالات اس قدر گھمبیر ہیں کوئی چھوٹا سا شعلہ بھی آگ کی صورت اختیار کر سکتا ہے اور ملک کے معاشی و سیاسی حالات مزید خرابی کی طرف جائیں گے۔ ایسی صورتحال میں سب سے بڑا سوال موجودہ حکومت کا مستقبل اور اسکا متبادل ہے۔ موجودہ حکومت کے مستقبل کے متعلق فوری طور پر کوئی پیش گوئی کرنا یقیناً ممکن نہیں۔ مضبوط وکلا تحریک کے نتیجے میں چیف جسٹس کی بحالی نے فوج اور بیوروکریسی کو بھی ہوشیار کر دیا ہے کہ اب حالات کافی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں لہٰذا کوئی بھی غیر جمہوری ہتھکنڈہ خطرناک شکل اختیار کر سکتا ہے۔ پیپلز پارٹی اور اس کے بعد اقتدار کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تمام پارٹیاں اب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو چکی ہیں کہ پاکستان کے حالات اب کسی بڑی انقلابی تبدیلی کے بغیر بہتر ہونا ممکن نہیں اور اس انقلابی تبدیلی کو یقیناً انقلابی نظریات کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ انقلابی تبدیلی صرف سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

معیشت

پاکستان کی معیشت پر سامراجی معاشی اثرات حاوی رہے ہیں لیکن 1990ء میں سوویت یونین کے انہدام اور عالمی معاشی و سیاسی تبدیلیوں کے بعد پاکستانی معیشت جس تیزی سے سامراجی ہاتھ میں گئی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ 1988ء میں فوجی آمر جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد بینظیر بھٹو حکومت اقتدار میں آئی تو وہ پہلے ہی یہ طے کر چکی تھی کہ وہ امریکی ایجنڈے اور مقاصد کی مخالفت نہیں کریں گی۔ بینظیر بھٹو نے امریکی سی آئی اے اور فوج کیساتھ معاہدے کے تحت اقتدار حاصل کیا تھا کہ وہ سامراجی مقاصد اور فوج کی امریکہ نواز پالیسی کو نہیں چھیڑیں گی۔ بینظیر بھٹو کی حکومت نے اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں کی جانے والی تمام معاشی اصلاحات، صنعتوں اور دیگر اداروں قومی تحویل میں لینے کی پالیسی عملی طور پر ختم کرتے ہوئے نجکاری کے ایجنڈے کے تحت معیشت کو لبرلائز کرنا شروع کر دیا اور ملک کے تمام منافع بخش اداروں کی نجکاری شروع کر دی۔ بعد ازاں میاں نواز شریف حکومت نے 22 جنوری 1991ء کو پرائیویٹائزیشن کمیشن تشکیل دے کر ملکی معیشت کو قومی تحویل سے نجی تحویل میں دینے کے ایجنڈے کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ نواز شریف حکومت یہ سب کچھ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ایجنڈے کے تحت کر رہی تھی۔ اس ایجنڈے کے تحت سب سے اہم کام جو اس حکومت نے کیا وہ اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام (SAP)، قومی اداروں کی نجکاری، ڈاؤن سائزنگ اور تجارتی ڈی ریگولیشن تھی یعنی تجارت کی لبرلائزیشن کے راستے میں حائل تمام رکاوٹوں کو ختم کرنا تھا۔ جس سے معیشت تیزی سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کنٹرول میں چلی گئی۔

مختلف حکومتوں کی طرف سے شروع کی جانے والی نجکاری کے نتیجے میں 1991ء سے 2007ء تک تقریباً 165 ادارے کوڑیوں کے دام فروخت کیے گئے جسکے نتیجے میں نہ صرف لاکھوں محنت کش بیروزگار ہوئے بلکہ یہ عمل ملکی معیشت میں بہتری کی بجائے تمام اداروں کی تباہی لایا۔ اس کی بنیادی وجہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی عوام دشمن شرائط کو من وعن تسلیم کرنا تھا۔ عوام کو روٹی کپڑا اور مکان دینے کا نعرہ لگانے والوں نے ہی عوام سے روٹی، کپڑا اور مکان چھیننا شروع کر دیا تھا۔ عالمی سامراج کے اس معاشی وسیاسی ایجنڈے کو بینظیر کے بعد آنے والے حکمران نواز شریف، پرویز مشرف اور اب گیلانی حکومت بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پاکستان اس وقت آئی ایم ایف کا تقریباً 52.5 ارب ڈالر کا مقروض ہے۔ اسی طرح قومی بجٹ کا تقریباً 46 فیصد قرضوں کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔ ملکی معیشت میں ترقی کی شرح صرف 2 فیصد ہے۔ مشرف دور میں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ یہ سات فیصد ہے۔ 2008 اور 2009ء کے معاشی سروے کے مطابق پاکستانی معیشت تقریباً تمام شعبوں میں زوال کا شکار ہے۔ 4.5 فیصد سے معیشت میں ترقی کا جو ہدف طے کیا گیا تھا وہ بڑی مشکل سے صرف 2 فیصد تک پہنچایا گیا ہے۔ زرعی شعبے میں کچھ بہتری کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ یہ 4.7 فیصد کے تناسب سے بڑھی ہے۔

اسی طرح تیل کی قیمتوں میں اضافے کا کوئی اخلاقی جواز نہ تھا۔ پاکستانی حکومت تیل کے ایک لیٹر پر کم از کم 35 روپے ٹیکسوں کی صورت میں کما رہی ہے۔ تیل کمپنیوں نے جسٹس بھگوان داس رپورٹ کے مطابق غیر معمولی منافعے کمائے ہیں۔ غیر ملکی اور ملکی کمپنیوں کے ان غیر معمولی منافعوں کی بنیاد جنرل مشرف کے دور میں رکھی گئی۔ اقتدار میں آتے ہی دسمبر 1999ء میں جنرل مشرف نے ڈی ریگولیشن پالیسی پر عمل درآمد کرتے ہوئے آئل کمپنیز ایڈوائزری کمیٹی (OCAC) کی تشکیل دی گئی۔ یہ آئل کمپنیوں اور پیٹرولیم منسٹری کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی تھی جو ہر پندرہ روز بعد تیل کی قیمتوں کا تعین کرتی تھی۔ تیل کی کمپنیوں نے اس کمیٹی کا خوب فائدہ اٹھایا۔ بھگوان داس رپورٹ کے مطابق جولائی 2001ء سے 2009ء تک اس کمیٹی کے 114 اجلاس میں منسٹری آف پیٹرولیم کے نمائندوں نے صرف 3 مرتبہ شرکت کی۔ یعنی تیل کی قیمت کا فیصلہ تیل بیچنے والوں کے حوالے کر دیا گیا اور حکومت اس سے لاتعلق ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان ریفائنری 2007-08 کا منافع 2001-02ء کے مقابلے میں 3516 فی صد بڑھ گیا جبکہ اٹک پیٹرولیم کا منافع اسی سال 1398 فیصد بڑھا۔ شیل پاکستان 483 فیصد، پاکستان سٹیٹ آئل 440 فیصد، وشیوران جو پہلے کالٹیکس کہلاتی تھی کا منافع 170 فیصد بڑھ گیا۔ یہ غیر معمولی منافع تھے جس کی مثال شاید ہی کسی اور ملک میں دی جا سکتی ہو۔

جسٹس ریٹائرڈ بھگوان داس کی 74 صفحات پر مشتمل رپورٹ کے مطابق جب بھی تیل کی قیمتیں عالمی سطح پر بڑھتی تھیں پاکستان میں کمپنیوں کا منافع زبردست بڑھ جاتا تھا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے کمپنیوں کو

ایک خصوصی ریزرو رکھنے کی اجازت دی گئی کہ مستقبل کے نقصانات کا مداوا کیا جا سکے۔ مگر اس کو منافع جات بڑھانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ رپورٹ میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ CNG جس پر حکومت کا خرچہ فی لیٹر صرف 17 روپے آتا ہے اسے کیوں 52 روپے فی لیٹر بیچا جا رہا ہے۔ کمیشن نے ایل پی جی کی امپورٹ پر عائد 16 فیصد جی ایس ٹی ہٹانے کی تجویز بھی رکھی۔

تیل کی قیمتوں میں اضافے کے اس پس منظر میں ایک اور طوفان بجلی کی قیمتوں میں اضافے اور لوڈشیڈنگ کی وجہ سے آ رہا ہے۔ حکومت بجلی کی پیداوار بڑھانے میں ناکام ہو چکی ہے جبکہ دوسری جانب بجلی پیدا کرنے والی پرائیویٹ کمپنیوں کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق بجلی کی پرائیویٹ کمپنیوں (IPP) کو روزانہ دو ارب روپے ادا کیے جا رہے ہیں بجلی خریدنے کی مد میں۔

1994ء میں حکومت نے واپڈا کو بجلی پیدا کرنے سے روک دیا اور پرائیویٹ کمپنیوں کو بجلی پیدا کرنے کو کہا۔ یہ تمام ادارے انڈیپینڈنٹ پاور پلانٹس (IPP) پیپلز پارٹی کے تیسرے دور حکومت 1994-96ء کے دوران منظر عام پر آئے۔ 1994-96ء کے معاہدوں کے مطابق خود بجلی نہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پرائیویٹ کمپنیوں کو کہا گیا کہ بجلی پیدا کریں۔ ان کو تمام تر حکومتی مراعات دی گئیں۔ ان سے مہنگے داموں بجلی خریدنے کے معاہدے کیے گئے۔ ان معاہدوں کو میاں نواز شریف کی 1997-99ء کی حکومت نے بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا مگر بعد ازاں خاموشی اختیار کر لی گئی۔ اب بھی IPP دونوں ہاتھوں سے حکومت کو لوٹ رہی ہیں اور بلیک میل کر رہی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق حکومت نے ان کو 120 ارب روپے ادا کرنے ہیں۔ اگر ایک سوشلسٹ حکومت ہوتی تو سب سے پہلے ان آئی پی پی کمپنیوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا جاتا اور کسی حد تک بجلی کا مسئلہ حل ہو گیا ہوتا۔

بجلی کے بحران نے پاکستان بھر میں ایک نئی عوامی بغاوت کو جنم دیا ہے۔ ملک بھر میں روزانہ مظاہرے ہو رہے ہیں۔ بھوک ہڑتالیں جاری ہیں۔ واپڈا سے منسلک اداروں کو جلایا جا رہا ہے۔ حکومت کی جانب سے یہ موقف اختیار کیا گیا کہ بجلی کی کمی پیدا ہونے میں ہی مشرف آمریت کے دور میں بجلی بنانے کے منصوبوں پر کام نہ ہوا۔ جس کی وجہ سے بجلی کے بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جبکہ پیپلز پارٹی حکومت 1994-96ء میں بجلی بنانے والے پرائیویٹ اداروں کی لوٹ مار کے بارے میں مکمل خاموش ہے بلکہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ان بجلی بنانے والوں کی جانب سے تین سال کے دوران 3000 میگاواٹ بجلی پیدا ہونے نے ملک کو بجلی کے بحران سے بچایا۔

مسلم لیگ ق کا بیانیہ موقف ہے کہ چونکہ حکومت بجلی بنانے والے پرائیویٹ اداروں کو ادائیگی نہیں کر رہی اس لئے لوڈشیڈنگ عروج پر ہے۔ یعنی انہوں نے بڑی کمپنیوں کو اس بحران دور میں پیسے دلوانے کا مطالبہ کیا۔ لوگوں کو بجلی ملے نہ ملے ان کمپنیوں کو پیسے ضرور ملنے چاہییں۔

بجلی کے بحران کی دو بڑی وجوہات

بجلی کے موجودہ شارٹ فال کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک بجلی کی پرائیویٹائزیشن اور بجلی پیداوار میں پرائیویٹ کمپنیوں کا کردار اور دوسرا مشرف دور میں بجلی بنانے کے منصوبوں پر بڑھک بازی اور پن بجلی کے چھوٹے منصوبوں کی بجائے کالا باغ ڈیم بنانے کی ضد جاری رکھنا۔

ملک میں واپڈا ایک حکومتی ادارہ ہے جو بجلی کی پیداوار، تقسیم اور ریونیو اکٹھے کرنے کا کام کرتا تھا۔ 1988ء کے بعد سے ہی بجلی کی نجکاری کے منصوبوں پر عمل شروع ہوا۔ اس دور میں کوٹ ادو پاور پلانٹ کو پرائیویٹائز کر دیا گیا جبکہ اسی دور میں پرائیویٹ بجلی بنانے والے ادارے پاکستان میں کود پڑے۔

انڈیپنڈنٹ پاور پروڈیوسرز (IPPs) کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ایسے مالی ادارے ہیں جو بجلی پیدا کرنے میں فنانسنگ کرتے ہیں۔ یہ ایک غلط تصور ہے۔ IPPs اس وقت تک کسی بھی جگہ انویسٹمنٹ نہیں کرتے جب تک وہ حکومت یا دیگر اداروں سے ان کی پیدا کردہ بجلی کو فروخت کرنے کے لئے واضح معاہدے نہ کر لیں۔ یہ معاہدے بھی وہ اپنے منافع کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان معاہدوں کو (Power Purchase Agreement) یعنی PPA کہا جاتا ہے۔ ان معاہدوں پر حکومت سے ضمانت طلب کی جاتی ہے۔ حکومتی ضمانت کے بعد یہ پاور کمپنیاں اپنے لئے فنانس اکٹھا کرتی ہیں۔ یہ PPA بعض اوقات 35 سالوں تک کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ پاکستان میں 94-96 کے دوران HUBCO سمیت دیگر IPPs نے حکومت کے ساتھ انتہائی مہنگے داموں بجلی فروخت کرنے کے معاہدے کئے۔ جو بجلی اس وقت عالمی مارکیٹ میں 3 سینٹ فی کلوواٹ ملتی تھی پیپلز پارٹی حکومت نے اس کا معاہدہ 6 سینٹ فی کلوواٹ کے لحاظ سے کیا۔ اس وقت بھی یہ بہت شور مچا تھا کہ پیپلز پارٹی کے آصف زرداری نے بجلی کے معاہدوں میں بہت پیسے بنائے ہیں۔ میاں نواز شریف نے 1998ء میں الزام لگایا کہ HUBCO سمیت دیگر IPPs نے 94-96 بہت مہنگے اور فراڈ والے معاہدے کئے ہیں مگر اس ضمن میں کرپشن کے چارج باضابطہ طور پر نہ لگائے گئے۔ 1999ء میں حکومت کی تبدیلی کے بعد IPPs کے ساتھ مکمل صلح کر لی گئی اور ان کی مرضی کے مطابق ان کو ریٹس ادا کئے گئے۔ مشرف آمرانہ دور میں بجلی کی کمپنیوں نے دونوں ہاتھوں سے پیسے کمائے۔

بجلی کے بحران کی دوسری بڑی وجہ مشرف دور میں پن بجلی کے منصوبوں پر بڑھک بازی جاری رکھنا اور کالا باغ و بھاشا ڈیم جیسے ناقابل عمل منصوبوں کو ہر صورت جبراً بنانے کی ضد کرنا تھا۔ مشرف دور میں ہی قائم کی جانے والے اے جی این قاضی رپورٹ نے واضح طور پر حقائق بتاتے ہوئے کالا باغ ڈیم کو ایک ناقابل عمل منصوبہ

اور خطرات سے بھرپور منصوبہ قرار دیا تھا مگر مشرف تین صوبوں کی زبردست مخالفت کے باوجود اس منصوبے پر عملدرآمد کرنے کی رٹ لگاتا رہا۔ مسلم لیگ نواز نے تو اپنے منشور میں یہ لکھ دیا تھا کہ وہ کالا باغ ڈیم بنائیں گے۔ اس بڑے ڈیم کے لئے ضروری پانی ہی موجود نہ تھا۔ اس ایشو پر مشرف آمریت نے قومی انتشار کو مزید تیز کر دیا۔

اس وقت ملک میں بجلی پیداوار کی صلاحیت 19500 میگاواٹ ہے جس میں سے 6500 میگاواٹ پانی سے یعنی ہائیڈل پاور ہے جبکہ 13000 میگاواٹ تھرمل پاور ہے یعنی اسے گیس یا فرنس آئل سے پیدا کیا جا رہا ہے۔ 450 میگاواٹ نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے پیدا کی جا رہی ہے جبکہ صرف 150 میگاواٹ کوئلہ سے پیدا کی جا رہی ہے۔ تھرمل طریقہ کار میں گیس سے پیدا ہونے والی بجلی کم ہے جبکہ فرنس آئل سے زیادہ پیداوار کی جا رہی ہے۔ تھرمل طریقہ کار ایک مہنگا طریقہ کار ہے۔ پیپلز پارٹی حکومت (94-96) نے اس مہنگے طریقے کار سے بجلی پیدا کرنے کی حکمت عملی اختیار کی اس کی وجہ سے ہی بجلی کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ عوام کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ جب تیل مہنگا ہو تو پرائیویٹ بجلی کمپنیوں نے بجلی بنانا ہی بند کر دی تا کہ انہیں "گھاٹا" نہ پڑے لیکن جب تیل سستا ہو تو یہی بجلی کمپنیاں اپنی قیمت کو کم کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔

KESC کو مشرف آمریت دور میں 2005ء کے آخر میں پرائیویٹائز کیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ اسے خریدنے والی کمپنی بجلی کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرے گی۔ اس کی تقسیم بہتر کرے گی اور سسٹم کے نقصانات کم کرے گی۔ مگر یہ تینوں کام نجکاری کے تقریباً 4 سال مکمل ہونے کے بعد بھی رتی بھر پورے ہوتے نظر نہیں آرہے۔ لاطینی امریکہ میں 1980ء اور 1990ء کی دہائی میں پانی، بجلی، گیس اور تیل کی نجکاری کے نتائج پر نظر دوڑائی ہوگی۔ ان چاروں شعبوں کی نجکاری نے ان تمام ممالک کے اندر ان شعبوں میں زبردست بحران پیدا کیا اور بعد ازاں ان ایشو پر چلنے والی تحریکوں نے وہاں کی گئی حکومتوں کو ختم کر دیا اور نجکاری کے ان طریقوں کو ختم کر دیا۔

کراچی کا مسئلہ بجلی کی نجکاری نہیں تھی بلکہ KESC کی نجکاری نے کراچی میں اس ایشو کو مزید گھمبیر کر دیا ہے۔ بجلی کی نجکاری کو مرحلہ وار طریقے سے کیا جا رہا ہے۔ اس وقت حکومت نے WAPDA کے ٹکڑے تقسیم کرنے کے لئے 13 سی آزاد کمپنیاں تشکیل دی ہیں۔ ان میں PEPCO یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ 2009ء کے آخر تک بجلی کی موجودہ لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے گی۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک دفعہ پھر پرائیویٹ بجلی گھروں کے لگانے کی حکمت عملی اختیار کی ہے۔ اس اشتہار کے بعد تو پیپلز پارٹی حکومت نے 3000 میگاواٹ حاصل کرنے کے لئے کرایہ پر بجلی پاور پلانٹ لینے کی حکمت عملی بھی اختیار کی ہے۔ ایک طرف دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہماری پیداواری صلاحیت میں نئے پرائیویٹ بجلی گھروں کے چلنے سے 3000 میگاواٹ کا گیپ ختم ہو جائے گا اور دوسری

جانب کرایہ پر بجلی پلانٹ حاصل کرنے کی بات کی جا رہی ہے۔

PEPCO کے اشتہار کے مطابق اٹلس پاور (225 میگاواٹ) سمندری روڈ پاور (150 میگاواٹ) نشاط پاور (200 میگاواٹ) فوجی مری پاور (202 میگاواٹ) مریدکے پاور (225 میگاواٹ) ساہیوال پاور (225 میگاواٹ) گرو پاور (110 میگاواٹ) سمبڑیال سیالکوٹ پاور (150 میگاواٹ) ستیانہ روڈ پاور (200 میگاواٹ) نوڈیرو پاور (51 میگاواٹ) کرکوپاور کراچی (249 میگاواٹ) پاور ایمن آباد (81 میگاواٹ) اینگرو پاور (227 میگاواٹ) ایوبق پاور پلانٹ (320 میگاواٹ) زارلو پاور (50 میگاواٹ) دسمبر تک 3000 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے لگ جائیں گے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ ان پرائیویٹ بجلی گھروں سے کس حساب سے بجلی خریدی جائے گی اور ان کمپنیوں کو کتنا منافع ہر سال متوقع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے IMF اور ورلڈ بینک سے جو گذشتہ ستمبر استنبول میں اپنے قرضہ کی تیسری قسط 840 ملین ڈالر لینے کیلئے کی اس میں بجلی کی قیمتوں میں 31 فیصد اضافے کا وعدہ کر چکی ہے جسے تین دفعہ قسطوں میں بڑھایا جائے گا۔ یعنی حکومت بجلی کی قیمتوں جو سرکاری سبسڈی دے رہی تھی وہ اب بجلی کی قیمتوں کو بڑھا کر پورا کیا جائے گا۔

حکومت نے بجلی کے شعبے پر جو بھی حکمت عملی اختیار کی اس سے بجلی مہنگی ہو جائے گی اور عوام پر مہنگائی کا ایک نیا بوجھ لاد دیا جائے گا۔ لوڈشیڈنگ تو شاید مہنگی بجلی خریدنے سے کم ہو سکتی ہے مگر عوام کس طرح اس مہنگی بجلی کو خریدنے کی سکت رکھیں گے اس کا کوئی جواب نہیں بجلی بارے حکومت تمام تر پالیسی IMF اور ورلڈ بینک کی ہدایت پر رکھی ہے ان اداروں کا مقصد حکومت کا نادہندہ ساڑھے سات ارب ڈالر کے قرضے کو واپس لینا ہے جس کے لئے وہ حکومت کو کہہ رہے ہیں کہ بجلی مہنگی کرو، تیل مہنگا کرو، حکومت ان پر سبسڈی نہ دے۔ جب تک حکومت ان اداروں کی شرائط مانتی رہے گی۔ بجلی کا بحران ایک یا دوسری صورت جاری رہے گا۔

ضرورت ہے کہ بجلی بنانے کے تمام پرائیویٹ اداروں کو فوری طور پر نیشنلائز کیا جائے۔ KESC کو دوبارہ قومی ملکیت میں لیا جائے۔ واپڈا سے علیحدہ ہونے والی 13 کمپنیوں کو ختم کر کے WAPDA کو بجلی بنانے تقسیم کرنے اور قیمتیں مقرر کرنے کا اختیار دیا جائے۔ واپڈا میں افسر شاہی ختم کی جائے اور واپڈا کے تمام معاملات میں ان کی منتخب یونین کے نمائندوں کو شریک کیا جائے۔ جب تک محنت کشوں کی منتخب کمیٹیاں واپڈا کے معاملات کو اپنے کنٹرول میں نہ لیں گی واپڈا بہتر کام نہ کر سکے گا۔ بجلی پیدا کرنا اور تقسیم کرنا جب تک پرائیویٹ ہاتھوں میں رہے گا مسائل بڑھتے رہیں گے۔ اس ضمن میں عالمی تجربات یہ واضح کرتے ہیں کہ بنیادی ضروریات کی نجکاری مہنگائی اور بے روزگاری کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔ ضرورت ہے کہ KESC سمیت تمام پرائیویٹ بجلی گھروں کو نیشنلائز کیا جائے اور اسے بیوروکریٹوں کے حوالے کرنے کی بجائے محنت کشوں کی منتخب کمیٹیوں کے

حوالے کیا جائے تا کہ ان کی کارکردگی بہتر کی جا سکے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کارپوریشن (OGDC) کی نجکاری کی کوشش کی جسے OGDC کے محنت کشوں نے بازور طاقت اپنی ہڑتال کے ذریعے ناکام بنا دیا تھا۔ موجودہ حکومت نے برآمدات کا ہدف 19 ارب ڈالر طے کیا ہوا تھا جو تقریباً 16 ارب ڈالر رہا جبکہ پچھلے سال اس سے بھی زیادہ یعنی 16.4 ارب ڈالر تھا۔ اسی طرح درآمدات تقریباً 26.7 ارب ڈالر رہی ہیں۔ ان دونوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو تجارتی خسارہ تقریباً 10.7 ارب ڈالر رہا۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں ان کے دعوے کے مطابق 12 ارب ڈالر کے فارن ریزروز تھے جو جون 2009ء تک کم ہو کر تقریباً 6 ارب ڈالر رہ گئے تھے اور ان میں مزید کمی آ رہی تھی۔ مشرف دور میں ایک بڑی رقم دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر آئی جبکہ بہت سارا پیسہ نجکاری کے نتیجے میں آیا۔ مشرف دور میں 7 ارب روپے بینک آف پنجاب، 83 ارب روپے پیٹرولیم، 780 ارب روپے پاکستان اسٹاک ایکسچینج، 120 ارب روپے متاثرین زلزلہ اور 36 ارب روپے چینی اسکینڈل یعنی ٹوٹل 2576 ارب روپے خرد برد کیے گئے۔ اس کے علاوہ اربوں روپے بینکوں سے قرضے معاف کروا کر حاصل کیے گئے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان میں اسٹیٹ بینک کی طرف سے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق 1997ء میں نواز شریف کے دور سے لیکر اب تک تقریباً 193 ارب روپے کے قرضے مختلف بینکوں اور دیگر اداروں سے لیکر معاف کروائے گئے لیکن مشرف آمریت کو "باعزت طور پر" فارغ کیا گیا۔ اسے باہر جانے کا موقع دیا گیا اور پیپلز پارٹی حکومت مشرف آمریت کو بچانے کی پوری کوشش کرتی رہی۔

آئی ایم ایف اور پاکستان

تاریخی اعتبار سے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف دونوں عالمی مالیاتی اداروں کا کردار اور پالیسی شروع سے ہی بڑی حد تک غیر جمہوری رہی ہے کیونکہ انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک میں آمرانہ حکومتوں کو قرضے دے کر انہیں مضبوط کیا ہے جبکہ یہی ادارے ہمیشہ سے جمہوریت کا نام تو لیتے ہی مگر ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے امریکہ کے کہنے پر جمہوریت، انسانی حقوق اور مزدوروں کے حقوق کے خلاف جابرانہ حکومتوں کی مدد کرتے ہوئے عالمی ملٹی نیشنل کارپوریشنز کو غریب ممالک میں کھل کھیلنے کی چھٹی دلوائی اور دوسری طرف انہی اداروں نے کئی جمہوری حکومتوں کو قرضے دینے سے انکار بھی کیا۔

مثال کے طور پر 1960ء میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے برازیل کے فوجی آمر کیسٹیلو برانکو کو بڑی مقدار میں قرضے دیئے جو کہ اس سے پہلے برازیل میں جمہوری حکومتوں کو دینے سے انکار کیا۔ اسی طرح پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کو تو دل کھول کر قرضے دیئے مگر فوری بعد آنے والی جمہوری حکومت کی حوصلہ افزائی

گئی۔ یہ پالیسی کئی شکوک و شبہات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے یہ قرضے فوجی آمروں نے عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کرنے کی بجائے عوام کو دبانے اور اپوزیشن کو کرش کرنے پر استعمال کیے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ان قرضوں کو خرد برد کرنے سے گریز نہیں کیا اور عام طور پر فوجی آمر اور ان کے ساتھی کرپشن کرتے ہوئے ان قرضوں کی بڑی مقدار ملک سے باہر یورپ کے بنکوں میں جمع کرا دیتے ہیں اور اس طرح ان قرضوں کی قسطیں اور ان پر سود غریب عوام ادا کرتے ہیں جبکہ اصل میں ان قرضوں کی رقم واپس انہی ملکوں میں پہنچ چکی ہوتی ہے جنہوں نے اپنے پیسے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک میں رکھے ہوئے ہیں۔

لہذا آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی طرف سے آمروں کی مدد کرنے کی پہلی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آمرانہ حکومتیں ان اداروں کی سخت شرائط فوراً قبول کر لیتی ہیں کیونکہ انہیں عالمی قبولیت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ 1970ء کی دہائی میں آئی ایم ایف اور دیگر مالیاتی اداروں نے غریب ممالک کی حکومتوں کو بے دریغ قرضے دیے اور خاص کر لاطینی امریکہ اور ایشیاء میں اربوں ڈالرز کے قرضے دیے لیکن 1970 کی دہائی کے آخر تک صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ ترقی کی بجائے ان ممالک میں وسیع پیمانے پر معاشی بحران جنم لینا شروع ہو گئے۔ 1982 میکسیکو نے اعلان کر دیا کہ وہ قرضوں اور ان پر سود کی ادائیگی کرنے کے قابل نہیں۔ تھوڑے ہی عرصے بعد برازیل، ارجنٹائن اور پھر کئی دیگر چھوٹے ممالک نے اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے اور اعلان کیا کہ وہ معاشی طور پر اس قابل نہیں کہ عالمی مالیاتی اداروں کے قرضوں کی ادائیگی کر سکیں۔

1970 کی دہائی کے آخر میں آنے والے معاشی بحران کے نتیجے میں عالمی مالیاتی اداروں کی پالیسیوں پر کڑی تنقید ہوئی مگر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے اس بحران کی ذمہ داری قبول کرنے کی بجائے یہ توجیہہ پیش کی کہ دراصل اس معاشی بحران کی وجہ ترقی پذیر اور غریب ممالک کے اندرون معاشی مسائل تھے۔ لیکن اس بحران کے بعد عالمی مالیاتی اداروں کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ ان کی موجودہ پالیسیوں کے نتیجے میں خدشہ ہے ان کے قرضے ڈوب سکتے ہیں اور مقروض ممالک اپنے آپ کو دیوالیہ قرار دے سکتے ہیں لہذا انہوں نے اپنے قرضوں کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام متعارف کرایا۔ اس پروگرام کے تحت مقروض ممالک پر سخت شرائط عائد کی گئیں اور ان کو مجبور کر دیا گیا کہ اپنے قومی اثاثہ جات کو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھ فروخت کر کے قرضے واپس کریں۔ اپنے ریاستی اخراجات میں کمی کریں۔ سماجی شعبے (صحت، تعلیم، ٹرانسپورٹ) کے اخراجات کم کریں۔ اپنی کرنسی کی قدر میں کمی کریں۔ بین الاقوامی تجارت پر عائد پابندیاں کم کریں۔ نجکاری کا عمل تیز کریں۔ عالمی کرنسیوں کی بیرون ملک روانگی پر پابندی ختم کریں۔ اور اپنی تجارتی منڈیوں کو بیرونی کمپنیوں کے لیے کھول دیں۔

لہذا سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام کے تحت پہلی بار عالمی مالیاتی اداروں کو ترقی پذیر ممالک کے اندر

معاشی پالیسی سازوں کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ اور اس طرح انہوں نے ان پالیسی سازوں کے ساتھ مل کر تیسری دنیا کے ممالک کی معاشی پالیسی سازی کے طریقہ کار پر عملاً قبضہ کر لیا۔ اب عالمی مالیاتی ادارے مشاورت کے نام پر معاشی پالیسی ڈرافٹ خود تیار کر کے مقامی پالیسی سازوں کے حوالے کرتے ہیں اور وہ بلا چوں چرا کیے ان ڈرافٹس کو پالیسی کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اس طرح عالمی مالیاتی اداروں اور بالخصوص آئی ایم ایف کی شرائط کو معاہدوں کے ساتھ ساتھ معاشی پالیسی میں بھی داخل کر دیا گیا۔ یہ کام مستقبل میں مقروض ممالک کے ذمے واجب الادا قرضوں کو تحفظ دینے اور ان کی واپسی کو ہر صورت میں یقینی بنانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

پاکستان جولائی 1950 میں آئی ایم ایف کا باقاعدہ ممبر بنا اور اس ادارے سے قرضے کا پہلا معاہدہ 1958 میں کیا جو 25 ملین ڈالر کا 10 ماہ کے لیے اسٹینڈبائی معاہدہ کیا گیا مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ معاہدہ منسوخ ہو گیا اور یہ قرضہ زیر استعمال نہ لایا جا سکا۔ اس کے بعد 1960 کی دہائی میں ایک ایک سال کے دو مزید اسٹینڈبائی معاہدے کیے گئے۔ اس سلسلے میں پہلا معاہدہ 1965 میں کیا گیا اور دوسرا 1968 میں۔ 1970 کی دہائی میں چار معاہدوں کے ذریعے آئی ایم ایف نے کل ملا کر 330 ملین ڈالرز کے قرضے دیے۔ 1958 سے 1979 تک آئی ایم ایف کا پاکستان کے ساتھ تعلق بالکل ویسا ہی تھا جیسا دوسرے ترقی پذیر ممالک کے ساتھ تھا مگر 1979 کے بعد افغانستان میں روسی فوج کی آمد کے بعد آئی ایم ایف کا رویہ پاکستان کی طرف زیادہ دوستانہ اور فراخدلانہ ہو گیا۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1958 سے 1979 (20 سالوں میں) تک آئی ایم ایف نے پاکستان کے لیے مختلف معاہدوں کے تحت 460 ملین ڈالرز کے قرضوں کی منظوری دی جبکہ 1980 سے 2001 تک (بیس سالوں میں) 6322 ملین ڈالرز کے قرضے منظور کیے جن میں سے پاکستان نے 3223 ملین ڈالرز کے قرضے حاصل کیے۔

سال 2000 کے بعد آئی ایم ایف کے مشرف آمریت کے ساتھ کیے گئے تین معاہدے اور حال ہی میں نومبر 2008 میں زرداری حکومت کے ساتھ کیا گیا۔ 7.6 بلین ڈالر قرضے کا معاہدہ (جس میں اگست 2009 میں 3.2 بلین ڈالر کا اضافہ کرتے ہوئے 11.3 بلین ڈالر کر دیا گیا ہے) اس کے علاوہ ہیں۔

1979 میں افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد کے فوراً بعد پاکستان کی طرف آئی ایم ایف کے رویے میں "انقلابی" تبدیلی آئی۔ اگر 1980 کی دہائی میں پاکستان کو دیے جانے والوں قرضوں کی نوعیت اور مقدار پر نظر دوڑائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ آئی ایم ایف نے امریکی احکامات کے تحت جنرل ضیاء جیسے آمر کی مکمل حمایت کرتے ہوئے دل کھول کر امداد کی۔ اس دور میں پاکستان کے لئے آئی ایم ایف کی فراخدلانہ امداد کے کئی ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر نومبر 1980 میں لانگ ٹرم ایکسٹینڈڈ فنڈ پالیسی (EFF) کے تحت آئی ایم ایف نے پاکستان کو 1.27 بلین ڈالر کے قرضے تین سالوں کے لیے عطا کیے۔ یاد رہے کہ یہ رقم 1958 سے 1980 تک (22 سالوں) کے دوران دیے گئے کل قرضوں کی مقدار سے تین گنا زیادہ تھی۔ اور اس کے ساتھ رکھی گئی شرائط اتنی کڑی نہیں تھیں جتنی 1988 کے بعد آنے والی جمہوری حکومتوں کے لیے رکھی گئیں۔ تاہم ضیاء آمریت سے یہ ضرور کہا گیا کہ وہ کرنسی کی قدر میں کمی کرے، سماجی شعبے پر سبسڈی ختم کرے اور پرائیویٹ سیکٹر کا قومی معیشت میں کردار کو بڑھایا جائے۔ لہذا ان شرائط پر عمل کرتے ہوئے ضیاء نے روپے کی قدر میں کمی کی۔ عوام پر عائد کردہ ٹیکسوں کی شرح میں اضافہ کیا اور پبلک سیکٹر کے کردار کو خاطر خواہ کم کر کے نجی شعبے کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ درآمدات پر پابندیوں میں نرمی کی۔ 1985 میں زرعی کھادوں اور 1988 میں زرعی ادویات پر سبسڈی ختم کر دی گئی جس کی وجہ سے چھوٹے کسانوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح توانائی کے شعبے، پٹرولیم مصنوعات اور گیس کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا گیا اور عام آدمی کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔ 1977-78 سے 1980-81 کے دوران آئی ایم ایف کی طرف سے قرضوں میں خاطر خواہ اضافے کو صرف امداد کے تناظر میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ اس امداد کے پیچھے امریکہ اور یورپی ممالک کے بے تحاشا مفادات کام کر رہے ہوتے ہیں۔

ان ممالک میں قائم کی ملٹی نیشنل کارپوریشنز (MNCs) کے مالیاتی امداد کے ساتھ معاشی مفادات بڑی سختی سے جڑے ہوتے ہیں۔ لہذا جب درآمدات پر پابندی ختم کرنے، مارکیٹ کو لبرلائز کرنے یا پرائیویٹ سیکٹر کے کردار کو بڑھانے کی شرائط پیش کی جاتی ہیں تو اس کا واضح مقصد ملٹی نیشنل کارپوریشنز کو کاروبار کے لیے کھلی چھٹی ہوتا ہے۔ لہذا 80 کی دہائی میں آئی ایم ایف کے ضیاالحق آمریت کو دیے جانے والے قرضوں کا واحد مقصد صرف آمر کو مضبوط کرنا یا پاکستان کو افغانستان میں روس کے خلاف استعمال کرنا نہیں تھا بلکہ پاکستان کے اندر نئی معاشی منطق کو بھی متعارف کرانا تھا جس کے ذریعے مقامی معیشت کو کمزور کرتے ہوئے نجی شعبے اور ملٹی نیشنل کارپوریشنز کو مقامی عوام کے استحصال کے لیے راہ ہموار کر کے دینا بھی تھا۔

1980 کی دہائی میں پاکستان کے ساتھ آئی ایم ایف کے معاہدوں کا اگر 1970 کی دہائی میں کیے گئے معاہدوں سے موازنہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ 1970 میں دیے گئے قرضے Stand By (SBA) معاہدوں کے تحت تھے اور ان پر شرح سود زیادہ تھی حالانکہ 1970 میں تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے پاکستان کی ادائیگیوں کا توازن خاصا بگڑ چکا تھا۔ پاکستان میں ایک جمہوری حکومت قائم تھی جسے امداد کی سخت ضرورت بھی تھی مگر آئی ایم ایف اس وقت کی جمہوری حکومت کو کسی طرح بھی سانس لینے کی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن اس کے برعکس 1980 میں جب پاکستان پر ضیا آمریت قابض ہو چکی تھی تو آئی ایم ایف نے

پاکستان کو نرم شرائط پر 1.27 بلین ڈالر کا قرضہ (جو کہ ترقی پذیر ممالک کو دیا جانے والا اس وقت تک سب سے بڑا قرضہ تھا) عطا کر دیا۔ نہ صرف ضیا آمریت پر آئی ایم ایف نے خوب مہربانی کی بلکہ پاکستان کے لیے "امدادی کنسورشیم" بنوا کر اور اس سے امداد دلوا کر پاکستان کے قرضوں کی ادائیگیوں کا آسان بندوبست بھی کیا۔

اس دور میں آئی ایم ایف کی طرف سے پاکستان کے لیے اٹھائے جانے والے یہ غیر معمولی اقدامات تھے جو عام پریکٹس سے ہٹ کر تھے۔ دراصل پاکستان کی طرف آئی ایم ایف کی اس پالیسی کو سیاسی تناظر میں بھی جانے کا مقصد دراصل پیشہ ور بینکروں سے ڈی لنک کر کے پاکستان کو کنسورشیم کے ممبر ممالک کے ساتھ براہ راست تعلقات استوار کروانا تھا تاکہ بدلتی ہوئی عالمی صورتحال کے پیش نظر یورپین طاقتوں کے معاشی اور سیاسی مفادات کو قائم رکھنے میں مدد دی جا سکے۔ اس کنسورشیم کی پہلی میٹنگ میں امریکہ نے اپنے قرضوں کی ادائیگی میں التوا کی منظوری دیتے ہوئے پاکستان کو 250 ملین ڈالر کا ریلیف دیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہی ریگن انتظامیہ جو 1979 سے تھوڑا پہلے تک قرضوں پر سخت موقف اپنا چکی تھی پاکستان کے لیے اچانک نرم گوشہ پیش کر رہی تھی۔ لہذا امریکہ اور آئی ایم ایف کے رویے میں نرمی معاشی بنیادوں پر کم اور سیاسی بنیادوں پر زیادہ تھی۔

مگر جیسے ہی روس افغانستان سے نکل گیا اور سوویت روس ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ آئی ایم ایف اور امریکہ کی دلچسپی اس خطے میں کم ہو گئی اور ان کی ترجیحات بدل گئیں۔ لہذا اگر 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں آئی ایم ایف کی طرف سے پاکستان کو دیے جانے والے معاشی پیکجز کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جتنے بھی قرضے پاکستان کو پیش کیے گئے ان کے ساتھ کڑی شرائط لاگو کی گئیں۔ سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کے تحت دیے جانے والے قرضوں میں رکھے جانے والی شرائط کی تعداد 27 (1985) سے بڑھ کر 56 (1989) ہو گئی۔ نہ صرف شرائط کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ ان کی نوعیت کو مزید سخت کر دیا گیا۔

جنرل ضیاالحق آمریت کے خاتمے کے بعد پاکستان میں نئی آنے والی جمہوری حکومت کے ساتھ آئی ایم ایف کا رویہ ماضی قریب کے برعکس نہایت غیر دوستانہ اور سخت رہا۔ بینظیر بھٹو حکومت کے ساتھ کیے گئے معاہدوں میں نہایت کڑی شرائط رکھی گئیں۔

1993ء میں آئی ایم ایف نے حکومت پاکستان کے ساتھ 3 سال کے لیے 265 ملین ڈالر کا اسٹینڈ بائی معاہدہ (SBA) کیا اور اس کے ساتھ وہ شرائط رکھیں جو اب آئی ایم ایف پروگرام کا باقاعدہ حصہ بن چکی ہیں۔ لیکن مالی سال 1995-96 کے بجٹ میں حکومت پاکستان نے آئی ایم ایف کی شرط کے مطابق مالی خسارے کو کم کر کے جی ڈی پی کا 5 فیصد کر دیا جبکہ آئی ایم ایف کا مطالبہ تھا کہ اسے 4 فیصد تک رکھا جائے۔ جس کی وجہ سے چپقلش نے جنم لیا۔

پاکستان میں کڑا معاشی بحران اس وقت آیا جب اس پر 28 مئی 1998 کو ایٹمی دھماکے کرنے کے

جرم میں سخت معاشی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ مئی 1998ء سے جنوری 1999ء تک کے سات ماہ پاکستان کا بہت بڑا امتحان تھا جب ملک دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ 1988ء سے لے کر اب تک آئی ایم ایف کا سب سے زیادہ زور بجٹ خسارہ کم کرنے پر رہا ہے۔ تمام وسیع مدتی اور کم مدتی معاہدوں میں ایک بات کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ پاکستان اپنا بجٹ خسارہ جی ڈی پی کے 4% تک لائے۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے دو اقدام درکار ہیں، ایک بھاری ٹیکس عائد کیے جائیں اور دوسرا حکومتی اخراجات کم کیے جائیں۔ مگر یہ دونوں کام ایسے ہیں جو کرنے سے کوئی بھی حکومت تیزی سے غیر پسندیدہ ہو جاتی ہے۔ لہذا کسی عوامی حکومت میں بھی ایسا کرنے کی جرات نہیں کیونکہ انہیں آخر کار عوام کے پاس جانا ہوتا ہے۔ پھر بھی 97-1994 کے دوران حکومت نے آئی ایم ایف کی شرائط کے مطابق ٹیکس دائرہ عمل کو بڑھاتے ہوئے 140 بلین روپے کے اضافی ٹیکس لگائے۔ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے عوام چیخ اٹھے۔ ان بالواسطہ ٹیکسوں کے نفاذ کے باوجود حکومت اپنا بجٹ خسارہ 4 فیصد تک کرنے میں ناکام رہی۔ لیکن اسے ریاستی اخراجات کم کرنا پڑے۔

آئی ایم ایف کا ایک اور دباؤ رہا ہے کہ اپنے ریاستی اثاثوں کی نجکاری کریں جس کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر بیروزگاری پیدا ہوئی ہے کیونکہ فروخت ہونے والے ادارے مزدوروں کو فارغ کر دیتے ہیں۔

آئی ایم ایف کے مطالبات ماننے کی پاکستان کو بہت بڑی سماجی قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ خواندگی کے اعتبار سے پاکستان ساؤتھ ایشیا میں سب سے پیچھے ہیں۔ ناخواندہ عورتوں کا تناسب باقی ساؤتھ ایشین ممالک کی نسبت سب سے زیادہ ہے۔ آدھی آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔ یہی حال نکاسی و صفائی کی سہولتوں کا ہے۔ 1995ء میں جب آئی ایم ایف شرائط نافذ کر رہا تھا تو 17 ملین بچے سکولوں میں داخل نہیں تھے، 60 ملین افراد کو صحت کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ 67 ملین افراد کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں تھا۔ 98 ملین افراد کو صفائی کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ اس سال 740,000 بچے غذائیت کی کمی کی وجہ سے فوت ہوئے۔ 36 ملین افراد خوفناک غربت کا شکار تھے۔ اور اسی سال کے اعداد و شمار کے مطابق ہر ڈاکٹر کے لیے 9 فوجی اور ہر ٹیچر کے لیے 3 فوجی تھے۔

9/11 کے نیویارک حملوں سے صرف ایک ہفتہ پہلے امریکی حکومت نے پاکستان پر واضح کیا تھا کہ اگر آئی ایم ایف سے قرضہ چاہیے تو ہماری سیاسی شرائط ماننا پڑیں گی اور اگر معاہدے کی شرائط سے ذرا سا بھی روگردانی کی تو اسلام آباد PRGF (پاورٹی ریڈکشن اینڈ گروتھ فیسلیٹی) کے تحت اگلی آؤٹ پیکج کی امید نہ رکھے۔ امریکہ اور آئی ایم ایف یہ بیان 9/11 سے صرف ایک ہفتہ پہلے استعمال کر رہے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے پاکستان کا آئی ایم ایف کے ساتھ تعلقات کا سارا دارومدار دراصل امریکہ کے ساتھ تعلقات پر منحصر ہے۔ اگر امریکہ کے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں تو آئی ایم ایف بھی ہرگز مدد نہیں کرے گا۔

فروری 2008 کے عام انتخابات کے بعد جب موجودہ پی پی پی حکومت برسر اقتدار آئی تو مشرف آمریت کے آئی ایم ایف سے کیے گئے وعدوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اگست 2008 میں مشرف کی رخصتی کے فوری بعد پاکستان کے زر مبادلہ کے ذخائر تیزی سے کم ہونا شروع ہو گئے۔ اور صرف 4 بلین ڈالر کی سطح پر آ گئے۔ پاکستان کو 300-250 ملین ڈالر ہر ہفتے درآمدی بل پر خرچ کرنے پڑ رہے تھے اور ملک تقریباً دیوالیہ ہونے کے قریب تھا۔ نئی حکومت نے سعودی عرب، چین اور دیگر دوست ممالک سے معاشی مدد حاصل کرنے کے لیے بڑے ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ نہ بن پایا تو ایک بار پھر آئی ایم ایف کے دروازے پر دستک دی۔

2007 کے شروع ہونے والے معاشی بحران کے نتیجے میں آئی ایم ایف بہت سے غریب ممالک کے لیے ایک بار پھر "اُمید" کی کرن بن کر آیا ہے۔ یاد رہے کہ 2002 سے 2005 کے دوران آئی ایم ایف کے clients میں خاطر خواہ کمی ہو چکی تھی اور ایک عالمی معاشی ادارے کے طور پر اُس کی اہمیت خاصی کم ہو چکی تھی۔ کئی ممالک اس سے چھٹکارا حاصل کر چکے تھے اور بہت سے اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک آئی ایم ایف کے پاس ترکی اور جارجیا کے علاوہ کوئی بڑا client نہیں تھا اور امریکہ کے اندر بھی اس کی مخالفت میں آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ مگر حالیہ عالمی بحران نے آئی ایم ایف کو نئی زندگی دے دی۔ اس بحران نے کئی ممالک کی معیشتوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور اب وہ دوبارہ سے اس ادارے کے شکنجے میں آنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ خود صدر زرداری نے کہا کہ آئی ایم ایف کی کڑوی گولی نگلنے کے سوا پاکستان کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پی پی پی کی نئی حکومت آنے کے بعد روپے کی قدر میں 23 فیصد کی ریکارڈ کمی کی وجہ سے بیرونی قرضوں کا بوجھ بڑھ کر ایک دم 52 ارب ڈالر ہو چکا ہے۔ آئی ایم ایف کے قرضے کے بعد پاکستان کے زر مبادلہ کے ذخائر بڑھ کر تقریباً 11 ارب ہو گئے ہیں۔ مگر بیرونی سرمایہ کاری کی عدم موجودگی کی وجہ سے معاشی استحکام عارضی ہے اور اس وقت حکومت کا زیادہ تر انحصار جنرل سیلز ٹیکس اور پیٹرولیم کی قیمت میں اضافے سے ہونے والی آمدنی پر ہے۔

پیپلز پارٹی حکومت اور این آر او

اس ملک میں حکمران جمہوری ہوں یا فوجی آمر، سب نے قومی دولت کو بے دریغ لوٹا ہے اور ملکی معیشت کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کی طرف سے این آر او کو کالعدم قرار دیے گئے حالیہ فیصلے کے بعد ملکی سیاست بالکل نیا رخ اختیار کرتے ہوئے نظر آ رہی ہے کیونکہ این آر او ایک ایسا معاہدہ تھا جس کے ذریعے پرویز مشرف نے اپنے اس وقت کے حلیفوں، پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کو کچھ لے اور کچھ دے کی

بنیاد پر فائدہ پہنچانے کی کوشش کی تھی جبکہ پرویز مشرف کے زیر اثر سیاست دانوں اور مسلم لیگ ن کے علاوہ دیگر بہت سارے فوجی جرنیلوں و سول بیوروکریٹس کے خلاف کوئی بھی کرپشن اسکینڈل یا کیس نہیں بنایا گیا جس کا مطالبہ اب پیپلز پارٹی کی قیادت کرتے ہوئے نظر آ رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت نے سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے کے بعد یہ طے کر لیا کہ صدر زرداری سمیت اہم عہدوں پر بیٹھے ہوئے تمام لیڈرز اور بیوروکریٹس استعفیٰ نہیں دینگے بلکہ اپنا دفاع کرینگے۔ پیپلز پارٹی نے جو حکمت عملی ترتیب دی ہے اس کے مطابق سپریم کورٹ کے فیصلے کو عملی طور پر بے اثر کر دیا گیا۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کے بجائے اپنے ناقدین پر جوابی حملے کر رہی ہے اور یہ مطالبہ کرتے ہوئے نظر آ رہی ہے کہ تمام کرپٹ عناصر کو برابری کی بنیاد پر قانون کے سامنے لایا جائے۔ یہ ایک منافقانہ نعرہ ہے کیونکہ کرپٹ افراد اور اداروں کو پیپلز پارٹی ہر دور میں تحفظ دیتی رہی ہے۔

پیپلز پارٹی حکومت کے فوری ختم ہونے کے امکان نظر نہیں آتے۔ صدر زرداری کی طرف سے این آر او کے اپنے اقتدار کے خاتمے کا پروپیگنڈا کر کے اپنے خلاف اقدامات کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ فوجی آمریت کے حواری فوری اقتدار سنبھالنے کی خبریں جان بوجھ کر پھیلائی گئیں تاکہ موجودہ حکومتی عناصر اور ان کی ٹوٹی پھوٹی جمہوریت پر تنقید کا سلسلہ روکا جا سکے۔

سپریم کورٹ کا این آر او پر فیصلہ متوقع تھا۔ این آر او اس قدر کالا قانون تھا کہ وہ عناصر بھی اس کا دفاع نہ کرنے پر مجبور ہوئے جنہوں نے اس سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ان میں ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی سرفہرست ہیں مگر اس کے خاتمے کے فیصلہ میں سپریم کورٹ کے ججوں نے آئین میں جنرل ضیاء الحق کی طرف سے ٹھونسی گئی بعض آئینی شقوں کو شامل کر کے اسے اسلامی رخ دینے کی کوشش کی۔ ان شقوں کو فیصلہ کا حصہ بنانے سے ججوں نے اس فیصلہ کو کسی حد تک متنازعہ بنا دیا۔ ان شقوں کے بغیر فیصلہ ایک واضح اور زیادہ غیر جانبدارانہ ہوتا۔

این آر او پر فیصلہ آنے کے بعد فوری طور پر پیپلز پارٹی حکومت کی جوابی کارروائی مارشل لاء لگنے کے خطرہ کا شور و غوغا تھا۔ لیبر پارٹی کا اس ایشو پر واضح موقف ہے "ہم تمام کرپٹ عناصر اور اداروں کے خلاف کارروائی چاہتے ہیں" جن افراد پر کرپشن کے الزامات لگے انہیں صفائی کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ہم کرپشن کرنے والے کسی بھی شخص یا ادارے کا کسی بھی جواز یا بہانے کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ اب ایسے محسوس ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی فوری طور پر سرنڈر نہیں کرے گی بلکہ اس لڑائی کو آگے تک لے جائے گی اور حکمت عملی کے تحت اپنے مخالف کو مصروف رکھتے ہوئے جو لوگ این آر او کی لسٹ سے باہر ہیں انہیں اس لسٹ میں لانے کی بات کرے گی۔ اس طرح پیپلز پارٹی اگر ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اس حمام میں سب ننگے ہیں کے مصداق حکمران طبقے کے درمیان وقتی اتحاد کی فضا پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ حکومت اور اپوزیشن دونوں ایک دوسرے کا

احتساب کرنے کی بات کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اپوزیشن مصالحت کا رویہ اختیار کر رہی ہے۔ یہ مفاہمت لمبے عرصے تک چلنے والی نہیں ہے کیونکہ پاکستانی سیاست میں حکومت کی تبدیلی کے حوالے سے اندرونی تضادات کے علاوہ بیرونی مداخلت بھی انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ بیرونی مداخلت میں سب سے اہم کردار امریکہ کا ہے۔ اب پاکستان پیپلز پارٹی کے مستقبل کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ وہ کس حد تک امریکی مقاصد کو پورا کر پاتی ہے۔

امریکی حکمران یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وکلاء تحریک کے نتیجے میں بحال ہونے والی عدلیہ اب اتنی بے اثر نہیں ہے اور پھر پور عوامی حمایت رکھتی ہے چنانچہ وہ قانون کے مطابق عدلیہ کے فیصلوں کی حمایت کا اعلان کرتے رہے ہیں۔ امریکی سامراج یہ بھی سمجھ چکا ہے کہ کوئی فوجی طالع آزما اب راتوں رات اقتدار پر قبضہ کر کے امریکی مفادات کے لئے کام نہیں کر سکتا کیونکہ پاکستانی عوام کے سامنے اب وکلاء اور عوام کی صورت میں مزاحمتی قیادت موجود ہے جو کسی بھی صورت میں آمریت کو خوش آمدید نہیں کریں گے چنانچہ مارشل لاء کا فوری امکان نہیں۔ البتہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گیلانی حکومت ایک مفاہمتی ماحول بحال کر کے سترھویں آئینی ترمیم منظور کرانا چاہتی ہے۔ اس کے بعد حکومت کی اندرونی سطح پر تبدیلیاں ممکن ہیں۔

پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن

پیپلز پارٹی کی خارجہ پالیسی کو بھی مسلم لیگ نواز کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ امریکی سامراج کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ وہ پاکستان بارے تمام فیصلوں میں مسلم لیگ نواز کو آن بورڈ رکھے۔ اس سے صلاح مشوروں اور اعتماد بلڈنگ کا عمل مسلسل جاری ہے۔ امریکی سفیر ہوں یا ان کی حکومت کا کوئی اعلیٰ عہدیدار، ہالبروک ہوں یا ہیلری کلنٹن، یہ سب پیپلز پارٹی کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ نواز سے ملاقات کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وزیرستان اور سوات میں فوجی آپریشن کو مسلم لیگ نواز کی مکمل حمایت حاصل رہی ہے اور امریکی سامراج کے "دہشت گردی کے خلاف اتحاد" کو بھی مسلم لیگ نواز مکمل حمایت کرتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلم لیگ نواز اور پیپلز پارٹی کے معاشی پالیسیوں اور خارجہ پالیسی میں کوئی خاص بڑا فرق نظر نہیں آتا۔

ان دونوں کے درمیان جو تضاد ہے وہ اقتدار میں آنے کا ہے۔ اس سے قبل ایک بڑا تضاد عدلیہ کے ججوں کی بحالی کے ایشو پر نظر آیا جس میں پیپلز پارٹی وعدے کے باوجود ان ججوں کو بحال کرنے میں ناکام رہی تھی۔ مسلم لیگ نواز اور دیگر جماعتوں نے وکلاء کے ساتھ مل کر تحریک چلا کر پیپلز پارٹی کو مجبور کیا تھا کہ وہ ججوں کو بحال کر دے۔ اس ایشو پر پیپلز پارٹی قیادت کو خاصی سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک اور اختلاف صدارتی اختیارات پر ہے۔ سترھویں ترمیم کے ذریعے ایک آمر نے صدارتی اختیارات میں خاصہ اضافہ کر دیا تھا۔ اب صدر کے اختیار

میں ہے کہ وہ کسی بھی وقت پارلیمنٹ کو تحلیل کردے اگرچہ اسے 15 دن کے اندر اندر اپنی وجوہات سپریم کورٹ میں بتانی ہوں گی۔ اسی طرح ججوں اور فوج کے اعلیٰ عہدیداروں کی تقرریوں کا اختیار بھی صدر کے پاس ہے۔ پیپلز پارٹی بار بار سترہویں ترمیم کو ختم کرنے کی بات کرتی ہے۔ اس کے لیے اس نے دسمبر 2009 کی تاریخ بھی دی تھی کہ نیا سال سترہویں ترمیم کے خاتمے کے ساتھ ہی طلوع ہوگا۔ مگر 2010 کا پہلا سورج اس ترمیم کے بغیر ہی طلوع ہو گیا۔ اس ایشو پر بھی دونوں جماعتوں کے درمیان تضاد موجود ہے۔ پھر تیسری دفعہ وزیر اعظم بننے پر بھی پابندی عائد ہے۔ مسلم لیگ نواز اس پابندی کا خاتمہ چاہتی ہے تاکہ میاں نواز شریف کے لیے تیسری دفعہ وزیر اعظم بننے کے امکانات موجود ہیں۔

اگر مسلم لیگ نواز کی تمام تر پالیسیوں اور حکمت عملی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک رائٹ ونگ بورژوا سیاسی جماعت ہے جو اپنے جمہوری (Credentials) کو مضبوط کرنا چاہتی ہے۔ ایک آمر ضیاءالحق کی حمایت سے بننے والی یہ جماعت اب فوجی آمریت کے خلاف سب سے زیادہ بات کرتی ہے۔ اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسے زیادہ یقین کرانا پڑتا ہے کہ وہ ایک جمہوری جماعت ہے۔ میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف دونوں نے ماضی میں سیاست کے اندر جو غیر جمہوری رجحانات اور بڑی سرگرمیوں کو متعارف کروایا تھا وہ اب بھی ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ سیاست میں پلاٹ، پیسے، تعلقات، برادری ازم، ڈویلپمنٹ اور دیگر غیر جمہوری رجحانات انہوں نے ہی متعارف کروائے۔ ان کی سیاست کا تاریک ترین پہلو جنرل ضیاءالحق کی آمریت کی حمایت اور مدد کے ساتھ اقتدار میں آنا اور فوجی آمریت کو سہارا دینا تھا۔ جو پرویز الٰہی 2002/2007ء میں پنجاب میں مشرف آمریت کے لیے کرتا رہا وہی کچھ میاں نواز شریف 1980/1988 تک ضیاءالحق آمریت کے لیے کرتے رہے۔ ان کی سیاست میں آمد اور سیاسی بصیرت فوجی آمروں اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی مرہون منت تھی۔ 1988ء میں اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے تمام دائیں بازو کو اکٹھا کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ 1990/1993 میں ان کا پہلا دور اقتدار بھی اسی صورتحال کی غمازی کرتا رہا مگر اس اقتدار کے دوران انہوں نے کسی حد تک آمرانہ روشوں سے چھٹکارا پانے کی کوششیں بھی کیں اور آزادانہ حیثیت منوانے کی جستجو بھی کی۔ ان کے غلام اسحاق کے ساتھ تضادات اور ان کا ڈٹ کر ان کو اقتدار سے ہٹانے کی کوششوں کے خلاف مقابلہ ان کی نئی حیثیت کو مضبوط کر گیا۔ اسی کا اظہار ان کے دوسرے اقتدار 1997/1999 کے دوران بھی ہوا اور فوجی جرنیلوں کے جمہوری کنٹرول کی کوشش ان کے اقتدار کے خاتمے کا باعث بھی بنی۔

مسلم لیگ نواز اس وقت انتہائی چالاکی اور ہوشیاری سے پیپلز پارٹی کو وقت اس لیے دے رہے ہیں کہ وہ اور بے نقاب ہو جائیں اور ان کی مقبولیت میں مزید کمی واقع ہو جائے۔ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ اس حکومت کو 5 سال پورے کرنے چاہیے تو ان کا مطلب یہ نہیں کہ وہ پیپلز پارٹی کو ایک حق کے طور پر پانچ سال تک حکومت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ پیپلز پارٹی حکومت اپنی سرمایہ دارانہ پالیسیوں کی وجہ سے عوام میں

مسلسل بے نقاب ہو رہی ہے لہٰذا وہ مرکز میں اقتدار کی شراکت کی خواہاں نہیں۔ جبکہ پنجاب کی حکومت کے دوران وہ بہتر طریقے سے اپنے لیے عوام میں مقبولیت بڑھانے کی کوشش میں ہیں۔ وہ مسلسل قرضہ جات حاصل کرکے خسارے کی پالیسیوں کے ساتھ انفراسٹرکچر کی کسی حد تک تعمیر اور خوراک میں ریاستی سبسڈی کے ذریعے اپنے آپ کو چاروں صوبوں کے عوام کے لیے مثال بنا کر پیش کرنے کی حکمت عملی پر گامزن ہیں۔ مسلم لیگ نواز مڈ ٹرم انتخابات کا مطالبہ ضرور کرے گی۔ وہ کب کرتی ہے یہ ابھی واضح نہیں مگر میاں نواز شریف ایک جارحانہ سیاست کے پھل کاٹ چکے ہیں وہ مزید پھل حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

بورژوا سیاست میں دو بڑی پارٹیوں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے غیر معروف ہونے کے بعد اب امریکی سی آئی اے کے ساتھ انتہائی قریبی تعلقات رکھنے والی ایم کیو ایم قومی سیاست میں متبادل بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ قومی سطح کی پارٹیوں کے عوام میں غیر مقبول ہونے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کسی بھی وقت کسی بڑی انقلابی تبدیلی کو جنم دے سکتا ہے۔ اسی لئے سامراجی قوتیں اپنے مقاصد آگے بڑھانے کیلئے ایم کیو ایم، تحریک انصاف، جماعت اسلامی اور اے این پی جیسی پارٹیوں کو بھی حمایت دے رہی ہیں۔ بائیں بازو کی سوشلسٹ نظریات رکھنے والی سیاسی پارٹیوں کیلئے حالات انتہائی سازگار ہیں کہ وہ موجودہ استحصالی نظام کے خاتمے کیلئے متبادل ایجنڈا لے کر سامنے آئیں۔ لیبر پارٹی پاکستان سمیت سوشلسٹ نظریات کی حامل تمام پارٹیوں کو مزدوروں، کسانوں اور سول سوسائٹی کی مزاحمتی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے اپنے نظریات کو فروغ دینا چاہیے۔ ان پارٹیوں کو چاہیے کہ وہ کچلے ہوئے محنت کش طبقے کو ایک پلیٹ فارم پر مضبوط تنظیمی ڈھانچے میں لاتے ہوئے انقلابی تبدیلی کی طرف لے جائیں۔

قومی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے والی بورژوا پارٹیوں کے درمیان پائے جانے والے تضادات کا تجزیہ کیے بغیر ہم ملکی سیاست کو نہیں سمجھ سکتے اور انہی تضادات کی آخری شکل اقتدار کی ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کی طرف منتقلی یا فوجی آمریت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ پاکستان میں اس وقت سب سے اہم بورژوا پارٹیاں پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ، ایم کیو ایم، اے این پی، مسلم لیگ ق وغیرہ ہیں۔ یہ تمام وہ پارٹیاں ہیں جو صرف اقتدار کی تبدیلی کے نعرے دے کر عوام کے مسائل حل کروانے کے سہانے خواب دکھاتی ہیں جبکہ حقیقت میں یہ تمام پارٹیاں موجودہ فرسودہ اور گلے سڑے سرمایہ داری نظام کی حقیقی محافظ ہیں۔ البتہ تحریک انصاف اور مذہبی جماعتیں درمیانے طبقات پر مشتمل رائیٹ ونگ پروگرام لئے اسی سسٹم میں بہتری کی نعرے بازی کر رہی ہیں۔ بنیادی طور پر ان تمام بورژوا پارٹیوں اور بورژوا پارٹیوں کے معاشی منشور ایک جیسے ہیں۔ ملک میں امریکی سامراجی مداخلت ہو یا آئی ایم ایف و ورلڈ بینک کی ترتیب دی گئی معاشی پالیسیاں ہوں، ان سب پارٹیوں کا عالمی سامراجی

معاشی وسیاسی ایجنڈے پر عمل درآمد سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقتدار میں آنے والے تمام فوجی جرنیلوں، بورژوا سیاسی لیڈروں اور ملاؤں نے نہ صرف پاکستان میں ہونے والی امریکی مداخلت پر اسمبلیوں کے فورم پر کوئی آواز نہیں اٹھائی ہے بلکہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی معاشی پالیسیوں، نجکاری، ڈاؤن سائزنگ، ڈی ریگولیشن اور تجارت کی لبرلائزیشن کی حمایت کی ہے جس کے نتیجے میں ملکی معیشت تباہ ہو چکی ہے اور ملک کے تمام بڑے منافع بخش ادارے بحران کا شکار ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ان عوام دشمن پالیسیوں کی حمایت کرنے والے اور ان پالیسیوں کو آگے بڑھانے کے نام پر سامراج سے گٹھ جوڑ کر کے اقتدار حاصل کرنے والے حکمران دراصل پاکستانی عوام کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ سامراجی قوتوں کے نمائندے ہیں۔

آپس میں صرف اقتدار کی بندربانٹ کے علاوہ ان کے درمیان کوئی حقیقی تضاد موجود نہیں ہے۔ حقیقی تضاد تو ہمیشہ مظلوم طبقات اور ظالم طبقات کے درمیان ہوتا ہے جس میں کچلے ہوئے مظلوم طبقات کو اپنے مسائل حل کرنے کیلئے اقتدار ظالم طبقات سے چھیننا ہوتا ہے اور انقلاب کر کے استحصالی سرمایہ دارانہ طبقاتی نظام کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ اس وقت مظلوم طبقات کی ایک بڑی اکثریت نے اپنی قوت کو بورژوا سیاسی پارٹیوں کے پیچھے لگا کر تقسیم کر رکھا ہے اور پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ ن، جماعت اسلامی، تحریک انصاف، ایم کیو ایم اور جمیعت علمائے اسلام جیسی سیاسی پارٹیاں اس ملک میں کوئی حقیقی تبدیلی لانے کی صلاحیت نہیں رکھتیں کیونکہ یہ تمام پارٹیاں محنت کش طبقات مزدوروں اور کسانوں کی نمائندہ نہیں، بلکہ مختلف طریقے سے پاپولر نعرے بازی، مذہبی، نسلی اور علاقائی تعصبات کو ہوا دے کر سامنے آئی ہیں۔ محنت کش طبقے کی سیاست تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر صرف طبقاتی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور محنت کش طبقے کی پارٹی صرف اور صرف اپنے طبقے کے مفادات کو سامنے رکھتی ہے۔ اس لئے پاکستان کی سیاست میں جب تک محنت کش طبقہ بورژوا سیاسی پارٹیوں کو خیرآباد کہہ کر اپنے طبقے کی پارٹی کی تعمیر نہیں کرے گا ملک کے حالات مزید گھمبیر ہوتے جائیں گے۔ لیبر پارٹی پاکستان جن بنیادوں پر تعمیر ہو رہی ہے وہ مستقبل میں محنت کش طبقے کی ایک متبادل پارٹی بننے کی تمام صلاحیتیں رکھتی ہے۔

کامیاب وکلاء تحریک کے مستقبل کی سیاست پر اثرات

پاکستان کی 62 سالہ سیاسی تاریخ میں عدلیہ کے انتہائی بھیانک کردار کے بعد ایک کامیاب وکلاء تحریک نے نئی عدلیہ کو جنم دیا۔ اس عدلیہ کا مستقبل میں کیا کردار ہو گا اور وکلا تحریک کے مستقبل کی سیاست پر کیا اثرات مرتب ہوں گے، اس کی کچھ نشانیاں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلوں کی روشنی میں نظر آنا شروع ہو گئی ہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلوں سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ وکلاء اور عوام کی طاقت نے عدلیہ کو جو آزادی دلوائی ہے سپریم

کورٹ اسے کسی حد تک استعمال کر رہی ہے۔ وکلا تحریک نے پاکستان کی سیاست میں ایک نئی روایت ہونا رقم کر دی ہے جسے مشعل راہ بنا کر پاکستانی عوام کبھی بھی سڑکوں پر آ سکتے ہیں۔ وکلاء نے اپنی تحریک کے نتیجے میں تمام کچلے ہوئے طبقات کو یہ سکھا دیا ہے کہ اگر ان کے درمیان اتحاد ہو گا اور وہ کسی بھی سیاسی مصلحت سے بالاتر ہو کر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کریں گے تو کامیابی کا حصول ناممکن نہیں ہے۔ وکلاء کی دو سالہ تحریک اور انکی کامیابی نے پاکستانی سیاست کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ یہ اس تحریک کی کامیابی کا ہی نتیجہ ہے کہ سول اور فوجی بیوروکریسی کی سازشوں کے ذریعے نام نہاد جمہوری نظام پر شب خون مار کر فوجی آمریت مسلط کرنا اب اتنا آسان نہیں رہا ہے۔ فوجی جرنیل، جاگیردار اشرافیہ، سول بیوروکریسی اور بورژوا سیاسی قیادت اب یہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ انکا کوئی بھی غیر آئینی اور غیر قانونی اقدام کسی بڑی تحریک کو جنم دے سکتا ہے۔

چیف جسٹس افتخار چوہدری کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے فیصلوں کا ہم ہمیشہ ایک طبقاتی نقطے سے جائزہ لے سکتے ہیں۔ ہماری اس سلسلے میں کوئی بڑی خوش فہمی بھی نہیں اور نہ ہی کوئی بہت بڑی امید لیکن عوامی تحریک کے اثرات اس وقت تک موجود رہیں گے جب تک عوامی تحریک زندہ رہے گی۔ عوام کا دباؤ ہی وہ واحد راستہ ہے جو کسی ایک فریق کو عوام دوستی کے راستے پر چلانے پر مسلسل آمادہ رکھ سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ریاست کے ان دو ستونوں کے درمیان لڑائی میں محنت کش طبقہ تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے قریب تر فریق کے ساتھ وقتی الائنس میں کھڑا ہو گا۔ اس کے ساتھ ہماری کوششیں محنت کش طبقہ کی اپنی قیادت، پارٹی اور سوچ کو فروغ دینے کی ہونگی نہ کہ کسی ایک فریق میں خوش فہمیاں پیدا کرنے کی۔ حتمی طور پر مزدور طبقہ کی قیادت میں کسانوں کی مکمل حمایت کے ساتھ ایک بڑی انقلابی تحریک ہی عوام کے بنیادی مسائل کے حل کی طرف ایک راستہ بن سکتی ہے۔

سرمایہ داری نظام میں پاکستان کی صورتحال ایک منفرد صورتحال اختیار کر رہی ہے۔ ایک جانب مذہبی جنونی قوتوں کا بذریعہ فوج کشی خاتمے کی حکمت عملی میں عدلیہ اور حکومت میں کوئی تضاد نہیں ہے اور دوسری جانب عدلیہ کی بحالی ایک عوامی تحریک کے نتیجہ میں ہوئی تو اس کا ایک اثر موجود ہے۔ وکلا تحریک قومی سطح کی تحریک تھی مگر اس تحریک سے قبل علاقائی سطح تک اوکاڑہ اور دیگر اضلاع میں چلنے والی مزارعین کی زمینوں کی ملکیت کے حوالے سے تحریک تھی جس نے مشرف آمریت کے خلاف سب سے پہلے کامیاب مزاحمت کی۔ اس تحریک کے خدوخال کو دیکھ کر ہی وکلاء تحریک نے اس کے بہت سے پہلوؤں کو اپنایا تھا۔

پچھلے چند سالوں میں فیصل آباد کی لیبر قومی موومنٹ کی تحریک بھی ایک بڑی طبقاتی تحریک کے طور پر سامنے آ رہی ہے اگرچہ یہ اس کی بھی ابتداء ہے مگر فیصل آباد کے پاورلومز مزدوروں نے قربانی، ایمان، مستقل مزاجی، طبقاتی شناخت اور جس حوصلے کا اظہار کیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ لیبر قومی موومنٹ کی تحریک کا دائرہ کار بڑھ رہا ہے اور اسے ملک کے ہر حصے میں پھیلانے کی جستجو جاری رہنی چاہیے۔

درست پرسپکٹو اور انقلابی پارٹی کی اہمیت

مستقبل کا تجزیہ یا پرسپکٹو کی اہمیت سماج کی تبدیلی کیلئے کام کرنے والی انقلابی سوشلسٹ پارٹیوں کیلئے سرمایہ دارانہ پارٹیوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ سوشلسٹ ہمیشہ ماضی کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے گزرتے ہوئے وقت یا حال کے تضادات کی روشنی میں مستقبل میں ہونے والی معاشی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں جس کے ذریعے سرمایہ داری نظام کا عوام دشمن ایجنڈا ان کے ساتھ بے نقاب ہو اور عوام کا رجحان انقلابی قوتوں کی طرف کرنے میں مدد ملے انقلابی قوتیں ہی سماج میں پیدا ہونے والی بے چینی کو منظم کرتے ہوئے سماج کی تبدیلی کے لئے فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں۔ محنت کش عوام کے باشعور گروہ اور تنظیمیں جب ایک انقلابی پارٹی کے گرد جمع ہونے شروع ہوتی ہیں تو انقلابی پارٹی ہر گزرتے لمحے کیساتھ انہیں عوام اور محنت کشوں کی مدد سے استحصالی سرمایہ دارانہ نظام پر حملے جاری رکھتی ہے اور سرمایہ داری نظام کے عوام پر ہونے والے تباہ کن اثرات کو بے نقاب کرتی رہتی ہے۔

گو کہ سرمایہ دارانہ جبر کے سب سے زیادہ واضح اثرات منظم محنت کش طبقات پر پڑتے ہیں لیکن عموی طور پر تقریباً پورا سماج ہی اس کے اثرات کی زد میں ہوتا ہے جس کی واضح مثال گزشتہ ایک سال سے جاری عالمی سرمایہ دارانہ معاشی بحران سے دی جا سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے مہنگائی، بیروزگاری، غربت اور طبقاتی تفریق میں بے انتہا اضافہ ہو چکا ہے۔ ایسے وقت میں انقلابی پارٹیوں کا کردار بڑھ جاتا ہے کیونکہ وہ عوام کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

تقسیم کے بعد پاکستان کے نام پر بننے والے ملک میں انقلابی پارٹیوں کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا جس کی وجہ سے پاکستان میں آج بھی جاگیردارانہ نظام کے خاتمے، سرمایہ داری جمہوریت کے مستقبل اور ریاست کی بنیاد جیسے سوال حل طلب ہیں۔ پاکستان کی 62 سالہ تاریخ میں تقریباً 32 سال تک فوج، سول بیوروکریسی، جاگیردار اشرافیہ اور امریکی سامراج کی مدد سے براہ راست اقتدار پر قابض رہی ہے جس کی وجہ سے فوج ایک مضبوط حکمران گروہ کے طور پر عالمی سامراج کے ساتھ تعلقات استوار کر چکی ہے۔ فوج کے طویل عرصے تک اقتدار میں رہنے کی وجہ سے ملک کے اقتصادی اور سیاسی نظام میں فوج سرایت کر چکی ہے۔ فوجی جرنل سیاسی پارٹیوں اور حکومتوں کو گرانے و بنانے میں ماہر ہو چکے ہیں۔ سیاسی نظام کی مضبوطی یقینا جمہوری عمل کے مسلسل رہنے سے ہی ممکن ہے لیکن اگر پاکستان کے مخصوص حالات کے تناظر میں اس کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ پاکستان کی سول و فوجی بیوروکریسی اور جاگیردار اشرافیہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ ایک ایسی کمزور اور

باج حکومت قائم رہے جو ان کے مفادات کو نہ چھیڑے۔ اس طرح فوج سول بیوروکریسی اور جاگیردار اشرافیہ سیاسی پارٹیوں و رہنماؤں کو شطرنج کے مہرے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے سیاسی نظام کو کمزور رکھنا چاہتے ہیں۔ حکمران طبقے کے درمیان موجود تضادات حقیقی تضادات نہیں ہیں بلکہ یہ تضادات اسی سسٹم میں رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کرنے کے حوالے سے ہیں۔ تمام سرمایہ دارانہ، سیاسی و مذہبی پارٹیوں، فوجی و سول بیوروکریسی، بین الاقوامی سامراج اور جاگیردارانہ اشرافیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موجودہ نظام جاری رہنا چاہیے۔ نظام کی تبدیلی اور انقلاب کا نعرہ ان کے لیے موت ہے لہٰذا ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ حقیقی انقلابی قوتیں آگے نہ بڑھ سکیں۔

لیبر پارٹی پاکستان کیلئے یہ انتہائی اہم وقت ہے کہ وہ مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کے اندر تیزی کیساتھ حکمران طبقے کے درمیان صرف اقتدار کے حصول کے لئے موجود تضادات کو بے نقاب کرتے ہوئے اپنے آپ کو متبادل کے طور پر تعمیر کرتے ہوئے محنت کش عوام کو لڑائی لڑنے کیلئے تیار کرے اس مقصد کیلئے پارٹی کو سوشلسٹ نظریات سے مسلح باشعور کیڈر تیار کرنا ہوگا تا کہ وہ عوام کی مختلف پرتوں کو باشعور کرتے ہوئے پارٹی کے ساتھ جوڑ سکے۔ بلاشبہ مارکس کی یہ بات درست ہے کہ انقلاب کا ہر اول دستہ محنت کش طبقے کا دستہ ہوگا جو اس گلے سڑے سرمایہ دارانہ نظام کے تابوت پر آخری کیل ثابت ہوگا۔

----☆----

جبر کا شکار عورت انقلابی تبدیلی کے لیے تیار

یوں تو پوری دنیا میں عورتیں جبر، استحصال امتیازی رویوں کا شکار ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کی پاکستانی عورت ملکی آبادی کا 52% ہے بدترین معاشی استحصال اور امتیازی سلوک کا شکار ہے۔ پاکستان کا نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ سماج ایک پدرسری معاشرہ ہے اس لیے یہاں عورت خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہو، صنفی بنیادوں پر دوہرے تہرے استحصال کا شکار ہے لیکن محنت کش طبقے کی عورتوں کو کہیں زیادہ مسائل کا سامنا ہے تعلیم اور روزگار کے مناسب مواقع نہ ملنا، کم اجرت، بلا معاوضہ کام، کام کی جگہوں پر صنفی امتیازی رویے اور جنسی اور ہراسانی جیسے مسائل کا سامنا ہے۔

پاکستانی عورتیں ملکی معیشت اور پیداواری عمل میں بھرپور حصہ لیتی ہیں۔ لیکن ان کی پیداواری صلاحیت اور محنت کو قانونی طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ لیبر قوانین اور سرکاری سطح پر بننے والی پالیسیوں میں یہ محنت کش عورتیں مکمل طور پر نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ یہ عورتیں کل لیبر فورس کا تقریباً 30% ہیں۔ جس کا 70 سے 80 فیصد غیر رسمی شعبہ سے وابستہ ہے وہ زراعت، ماہی گیری، اینٹ سازی، چوڑی کی صنعت۔

گارمنٹس، چمڑے کی مصنوعات، کاغذ کی مصنوعات، خشک میوہ جات کی پیکنگ، دوزی، قالین بافی جیسی صنعتوں سے وابستہ ہیں۔ ہنر مند ہونے کے باوجود غیر ہنر مند لیبر تصور کی جاتی ہیں۔ ان تمام صنعتوں سے منسلک محنت کش عورتوں کی اوسطاً ماہانہ آمدنی شرمناک حد تک قلیل ہے، جو کہ 1500 سے 2000 روپے ہے جبکہ انہیں 10 سے 12 گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا ہے۔

سول سروسز میں تقریباً 6 فیصد برسر روزگار ہیں۔ فارمل سیکٹر میں 14% عورتیں شامل ہیں۔ یہ شرح بنگلہ دیش میں 42% اور نیپال میں 41% ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتی اداروں اور دیگر شعبوں کے اندر پاکستانی عورت کی نمائندگی جنوبی ایشیاء کے دیگر ممالک کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

پاکستان کے لیبر قوانین غیر رسمی شعبوں کا احاطہ نہیں کرتے جہاں عورتوں اور نوجوان بچیوں کی بڑی تعداد کام کرتی ہے۔ جو ایک اندازے کے مطابق 20 ملین ہے۔ یوں یہ طبقہ قانونی تحفظ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے سرمایہ دارانہ استحصال اور جبر کا زیادہ شکار ہے۔

پاکستان میں مجموعی طور پر عورتوں کو معاشرتی سطح پر بدترین حالات کا سامنا ہے جو کسی بھی مہذب معاشرے کی نفی ہیں۔ تعلیم، روزگار، طبی سہولیات سمیت دیگر ضروریات کے لیے گھروں سے باہر نکلنے والی لڑکیاں اور عورتیں سڑکوں، بازاروں، دفاتر غرضیکہ ہر جگہ پر اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتی ہیں اور انہیں شرمناک سلوکی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عورتوں کے خلاف تشدد اور جرائم

ویسے تو گھریلو تشدد مہذب اور غیر مہذب معاشروں میں مختلف تناسب سے موجود ہے مگر پاکستان کی 80% سے زائد عورتیں مختلف نوعیت کے گھریلو تشدد کا سامنا ہے۔ جس میں نفسیاتی تشدد، جسمانی تشدد، اور جنسی تشدد کا شامل ہیں۔ ہر سال تقریباً 4000 عورتیں آتشزدگی کے واقعات کا شکار ہوتی ہیں۔ اوسطاً ہر ہفتے ایک عورت پر تیزاب پھینکا جاتا ہے۔ حمل جیسے نازک دور میں گھریلو تشدد کی بناء پر 2 گھنٹوں میں 60 عورتیں ہلاک کر دی جاتی ہیں۔ عورت پر بہیمانہ تشدد کی سب سے خوفناک شکل غیرت کے نام پر قتل ہے۔ جس کی روک تھام کے لیے موثر اقدام نہیں ہو سکے۔ ملک کے چاروں صوبوں اور ملحقہ قبائلی عورتوں میں عورتیں ظالمانہ رسم و رواج اور جرگے کے فیصلوں کے نتیجے میں اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ عورتیں اپنی مرضی سے شادی نہیں کر سکتیں۔ کم عمری ونی، کاروکاری، خرید و فروخت، قرض کے بدلے عورتوں کا تبادلہ ہونا، سوارا جیسی رسومات کی بھینٹ چڑھا دی جاتی ہیں۔ گذشتہ دس سالوں میں عورتوں کی اندرون ملک اور بیرون ملک ہجرت اور سمگلنگ کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

عورتوں کے خلاف جرائم، تشدد جیسی اذیت ناک صورتحال کے ساتھ ساتھ جنگ کے انتہائی منفی اثرات بھی عورتوں پر سب سے زیادہ پڑتے ہیں۔ 2009 کے پہلے 9 ماہ میں 463 عورتوں نے خودکشی کی 2008 میں یہ تعداد 803 تھی۔

تعلیم اور صحت

جہاں تک صحت کا تعلق ہے پاکستان میں زچگی کے دوران ناقص سہولیات کی وجہ سے 1000 میں سے 8 مائیں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ بعض علاقوں میں اس کی شرح 1400 فی لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ مجموعی طور پر ہر سال 30000 مائیں ہلاک ہو جاتی ہیں جو کہ پوری دنیا میں ہونے والی اموات کا 5% ہے۔ ہر 9 عورتوں میں سے 1 عورت بریسٹ کینسر کا شکار ہے پاکستان ایشیاء کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں یہ بیماری سب سے زیادہ ہے۔ عورتوں کو اپنے جسم پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اسقاط حمل اور بچوں کی پیدائش کے حوالے سے فیصلے وہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔

عورتوں میں تعلیم کی شرح صرف 18 سے 20% ہے جبکہ حکومت کا دعویٰ ہے کہ یہ شرح 40 فیصد ہے یاد رہے کہ عورتوں کی خواندگی کے اعتبار سے ساؤتھ ایشیاء میں سب سے نیچے کالجز میں لڑکیوں کے داخلے کی شرح 66% ہے۔ میڈیکل میں یہ شرح تقریباً 60 اور آرٹس میں 49% قانون کی طالب علم لڑکیوں کی تعداد 14.4%، کامرس میں 17.8% اور زراعت میں 8.9% ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں تعلیم میں چند ایک شعبوں تک محدود ہیں۔ ان شعبوں میں زیادہ تعلیم حاصل کرتی ہیں جنہیں عموماً عورتوں کے شعبے سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف ان پڑھی لکھی لڑکیوں میں زیادہ تر تعلیم حاصل کرنے کے بعد عملی زندگی میں کردار ادا کرنے کی بجائے شادی کر کے گھر کی چار دیواری میں بند ہو جاتی ہے۔

سیاسی عمل میں پاکستانی عورتوں کی شمولیت

پاکستان میں عورتوں کی سیاسی عمل میں دیرینہ اور موثر عدم شمولیت کی بیشمار وجوہات ہیں۔ بیشک ہمارا آئین عورت اور مرد کی برابری تسلیم کرتے ہوئے عورتوں کو سیاسی عمل میں شامل ہونے کی اجازت دیتا ہے مگر دوسرے کئی معاشروں کی طرح پاکستانی سماج عورت کو سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی بخوشی اجازت نہیں دیتا۔ جس کی وجہ سے پاکستان میں عورتیں سیاسی عمل کا باقاعدہ حصہ نہیں بن پائیں۔

سیاسی عمل میں موثر شمولیت نہ ہونے کی بنیادی وجوہات اور عناصر رکاوٹ ہیں ان میں اہم ترین ملکی سیاسی اور سماجی ناہمواری کمزور سیاسی ڈھانچے اور ادارے شامل ہیں۔

چونکہ موجودہ لبرل نظریہ صنعتی بنیاد پر تقسیم کے اصولوں پر استوار ہے۔ جو کہ پدر شاہی نظام کو برقرار

دیکھنے کے ساتھ ساتھ نظام حکومت اور سماج میں موجود صنفی تفریق کو نظر انداز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی و صوبائی اسمبلیوں میں 17% کل ارکان قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی 232 اور ضلعی حکومت میں 33% اور 40 ہزار سے زائد عورتیں کونسلر منتخب ہوئی۔ نمائندگی کے باوجود عورتیں ہمارے روایتی معاشرے میں مردوں کی فیصلہ سازی کے حکومتی کلچر میں کوئی واضح تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں رہیں۔

1970 سے 2008 تک قومی اسمبلی میں عورتوں اور مردوں کی نمائندگی کا تناسب:۔ 1970-72 کی اسمبلی میں کل نشستوں کی تعداد 144 تھی، جس میں 6 عورتیں شامل تھیں۔ 1972-77 کے پارلیمانی سال میں صرف ایک عورت اسمبلی تک پہنچی، جبکہ 145 مرد رکن اسمبلی تھے۔ 1997-99 قومی اسمبلی میں 217 نشستوں پر صرف 6 عورتیں رکن بن سکیں۔ 2008 کی منتخب شدہ موجودہ اسمبلی میں 76 عورتیں رکن بنیں۔ فروری 2008 کے انتخابات میں صوبہ سرحد، فاٹا، اور بلوچستان میں سیاسی پارٹیوں یا ان کے امیدواروں نے متفقہ طور پر فیصلہ کرنے کے بعد عورتوں کو ووٹ ڈالنے کے لیے باہر آنے کی اجازت نہ دی۔

2008: موجودہ سیٹ، قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں عورتوں کی نمائندگی سیٹ میں کل نشستوں 100 میں سے 17 عورتیں شامل ہیں۔ قومی اسمبلی میں 266 کے مقابلے میں 76، پنجاب اسمبلی میں 295 مردوں کے مقابلے میں 76 عورتیں رکن اسمبلی ہیں۔ سندھ اسمبلی میں 139 مرد اور 29 عورتیں رکن ہیں۔ سرحد اسمبلی میں 100 مردوں کے مقابلے میں 22 عورتیں اسمبلی تک پہنچی ہیں۔

بلوچستان میں 53 مردوں کے مقابلے میں 12 عورتیں رکن ہیں۔ اس طرح حکومتی ایوانوں میں 1165 کل نشستیں ہیں۔ جس میں 936 مرد اور 232 عورتیں ہیں۔ ان میں مخصوص نشستوں اور براہ راست الیکشن لڑ کر آنے والی عورتیں شامل ہیں۔ اس اسمبلی میں خواتین ارکان اسمبلی کا دیہی اور شہری تقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر 60 ارکان میں سے 31 خواتین کا تعلق بڑے چار شہروں یعنی لاہور، کراچی، پشاور اور کوئٹہ سے ہے۔ جبکہ 24 نشستوں پر تمام صوبوں سے خواتین شامل کی گئیں۔ اس طرح قومی اسمبلی کی مخصوص نشستوں کے لیے بھی بڑے شہروں سے تعلق رکھنے والی عورتوں نے کل نشستوں کا ایک بڑا حصہ حاصل کیا تاہم عورتوں کا آزادی دینے کی یہ حقیقت اپنی جگہ مگر نظریاتی اور طبقاتی بنیادوں پر غیر متوازن نمائندگی دراصل مردانہ معاشرے کی آئینہ دار ہے اور محنت کش عورتوں کی سیاسی شمولیت کو نظر انداز کرتی ہے۔ پدرشاہی نظام اور غیر جمہوری سیاست کے میدان میں جب عورتیں قدم رکھتی ہیں، تو صرف مردوں کے بھروسے پر اپنا سیاسی کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں۔ اور اپنے بل بوتے پر کسی بھی قسم کی تبدیلی لانے سے قاصر ہیں۔ اس ضمن میں جمہوریت کے نام پر دی گئی آزادی میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے تا کہ سیاسی منظر میں عورتوں کے حقیقی کردار کو یقینی بنایا جا سکے۔

4 نمایاں سیاسی جماعتوں کی مرکزی مجلس عاملہ میں عورتوں کا تناسب:۔

پاکستان پیپلز پارٹی میں کل تعداد ممبران 21 جبکہ عورتوں کی تعداد 3 ہے۔

مسلم لیگ ن میں کل 47 ہے جس میں 42 مرد اور 5 عورتیں شامل ہیں۔

مسلم لیگ ق میں 32 میں سے 5 عورتیں مرکزی کمیٹی کا حصہ ہیں۔

عوامی نیشنل پارٹی میں کل 21 ارکان میں صرف 2 عورتیں فیصلہ سازی میں شامل ہیں۔

لیبر پارٹی کی نیشنل کمیٹی 21 میں سے 6 عورتیں ہیں۔ تناسب کے اعتبار سے لیبر پارٹی کی مجلس عاملہ میں عورتوں کی نمائندگی بورژوا پارٹیوں کے مقابلے میں بہتر ہے۔

چونکہ صنفی نا ہمواری کی جڑیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر طاقت کے ڈھانچوں میں مضمر ہیں۔ اور عالمگیریت نے غربت میں بے پناہ اضافہ کے ساتھ ساتھ پسے ہوئے طبقات کو معاشرتی ڈھانچوں سے باہر نکلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لہذا ایسا حکومتی ڈھانچوں کے خلاف آواز بلند کرنے اور انہیں از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ پاکستانی عورت کے لیے برابر حقوق اور مواقعوں کا حصول بہت مشکل ہے۔ گو کہ پاکستان کا آئین عورت کو سیاسی شمولیت سے نہیں روکتا لیکن سماجی و معاشرتی ڈھانچے، مذہبی اور رجعتی نظریات عورتوں کو سیاسی دھارے میں موثر شمولیت کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔ عورتوں کے حقوق کے لیے عورتوں کی سماجی تنظیمیں اور مضبوط تحریکیں ہی ملکی سیاست اور مجموعی ترقی کی صحیح سمت اور انصاف کو یقینی بنانے کے لیے موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اس کے لیے خاندانی اور سماجی امور میں گنجائش اور از سر نو تشکیل جیسے بنیادی اقدامات ترجیحی بنیادوں پر کرنا ہوں گے۔ کسی بھی روایتی معاشرے میں واضح تبدیلی کا خواب عورتوں کو سیاسی عمل اور فیصلہ سازی کے اداروں میں موثر اور بامعنی کردار کے بغیر شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔

امتیازی پالیسیاں اور قوانین

عورتوں کے بارے میں امتیازی رویے اور تعصبات محض سماج کا حصہ ہی نہیں بلکہ یہ تشدد قانونی صورت میں موجود اور نافذ العمل ہے۔ جنرل ضیاء کے دور میں اسلامائزیشن نے عورتوں کی بنیادی شخصی آزادیوں کو نہ صرف سلب کیا بلکہ ایسے کالے اور امتیازی قوانین متعارف کرائے گئے جو عورتوں پر ضرب کاری کے مترادف ہیں۔ حدود آرڈیننس میں اسلام کے نام پر انتہائی درجے کی سزاؤں کو متعارف کرایا گیا۔ اس میں سر عام کوڑے لگانا، ہاتھ کاٹنا اور سنگسار کرنا شامل ہیں۔ زنا بالجبر اور زنا بالرضا کی تفریق ختم کر دیا گئی اور پورے معاشرے بشمول والدین اور شوہروں کو کھلی چھٹی دی گئی کہ وہ عورتوں کو نافرمانی، کی سزا دینے کیلیے اس قانون کا استعمال کریں۔ خصوصاً مرضی کی شادی کے نتیجے میں والدین نے اس قانون کا بے دریغ استعمال کیا۔ اس قانون کے مطابق اگر

شادی شدہ جوڑا نکاح ثابت نہ کر سکے تو زنا کو فرض کر لیا جاتا ہے۔

زنا بالجبر کو ثابت کرنے کے لیے انتہائی بے ہودہ شرائط رکھی گئی ہیں۔ جس میں چار گواہوں کی چشم دید گواہی وغیرہ کا حمل بھی اس کے ہی خلاف ایک ثبوت سمجھا جاتا ہے اگر عورت زنا بالجبر کا مقدمہ درج کرائے اور اسے ثابت نہ کر سکے تو وہ خود مجرم ٹھہرتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہزاروں عورتوں کو جیلوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی زندگیاں تباہ ہو گئیں۔ ویمن پروٹیکشن ایکٹ (تحفظ نسواں قانون) کے ذریعے عورتوں کو جزوی طور پر تحفظ دینے کی کوشش کی گئی لیکن مکمل طور پر کالا قانون ختم کرنے کی جرات نہ کی جا سکی۔ ملک میں عورتوں کے بنیادی حقوق کی حصولی حقیقی آزادی، برابری اور سماجی انصاف کے تقاضے ان قوانین کے مکمل خاتمے سے ہی ممکن ہے۔ گزشتہ مشرف آمرانہ دور کے آخری سالوں اور موجودہ حکومت کے عورتوں کے متعلق قانون سازی کی ابتدائی کوششیں کیں۔ جن ویمن پروٹیکشن ایکٹ، بچوں اور عورتوں کے خلاف جنسی ہراسانی کے خلاف بل 2009 پیش کیے گئے، جو تاحال قانونی شکل اختیار نہیں کر سکے۔ عورتوں کے حقوق پر کام کرنے والی سماجی تنظیموں نے ان دونوں مجوزہ قوانین پر جزوی طور پر تحفظات کا اظہار کیا۔

عورتوں کے سماجی حقوق پر کام کرنے والی سماجی تنظیموں نے ہوم بیسڈ ورکرز کی محنت کو قانونی طور پر تسلیم کرائے جانے کے لیے نیشنل پالیسی 2009۔ اور سوشل پروٹیکشن بل 2008 بھی پیش کیا۔ جو قانون کے ایوانوں میں پڑا ہے اور عورتیں ان قانون سازی کے لئے منتظم ہیں۔ حکومتی سطح پر عورتوں کے لیے بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کا اجراء کیا گیا ہے۔ جس کے تحت ماہانہ 1000 روپے کی ادائیگی کر کے 22 لاکھ خاندانوں کو غربت کی دلدل سے باہر نکالنے کا دعویٰ کیا گیا۔ اس مد میں حکومت نے 34 ارب روپے خرچ کیے۔ یہ پروگرام عورتوں کی اشک شوئی سے علاوہ کچھ نہیں۔

صوبہ سندھ میں حکومت نے ہاری عورتوں کو 44000 ایکڑ زمین تقسیم کر دی ہیں، جس کے تحت عورتوں کے ملکیتی حقوق اور زمین کے استعمال کا حق اور اختیار کی حقیقی بحرحال ایک سوالیہ نشان ہے کیونکہ اسکے متعلق واضح پالیسی موجود نہیں ہے۔ حکومت پنجاب بھی اس وقت بے زمین کسانوں کو زرعی زمین کی تقسیم کا منصوبہ جاری ہے۔ جس کے خدوخال واضح نہیں ہیں۔ خدشہ ہے کہ صدیوں سے زمین پر کاشت کرنے والے مقامی ہاری اور مزارع اور خصوصاً کسان عورتیں کھیت مزدور عورتیں اس تقسیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جب تک عورتوں کو جائیداد میں برابر حصہ، وراثت میں اٹھا سکیں گے۔ زرعی اراضی پر ملکیتی حقوق اور سماجی انصاف کے بغیر سماجی انصاف کے تقاضے پورے نہ ہو سکیں گے۔

گزشتہ دور میں ضلعی حکومتوں کو اختیارات کی منتقلی کے نظام میں عورتوں کو سیاسی عمل میں ایک خاص حد تک شامل ہونے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ موجودہ پنجاب حکومت اپنے سیاسی مفادات کے لیے اس نظام میں

بہت سی تبدیلیاں کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جس میں عورتوں کے لیے نشستوں کی کمی کی ترمیم زیر غور ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو ہمیں اس رجعت پسندانہ اقدام کی مخالفت کرنی چاہیے۔ بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے محنت کش عورتوں کی سیاسی نمائندگی کی وجہ سے جمہوری عمل پختہ ہوا۔ جسے مسلم لیگ (ن) پھر سے کمزور کرنا چاہتی ہے۔ عورتوں کے حقوق کی جدوجہد کرنے والی تنظیموں نے ان ترامیم پر کڑی تنقید کی ہے اور عورتوں کی نشستوں کے اضافہ کا مطالبہ کیا ہے۔

یوں تو پاکستان میں عورتیں، بچے اور مذہبی اقلیتیں معاشرتی اور قانونی سطح پر غیر محفوظ ہیں۔ وہیں پر اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو کچھ مخصوص مسائل کا بھی سامنا ہے جیسا کہ ہندو مذہب میں شادی کی رجسٹریشن نہ ہونا۔ جس کی وجہ سے ہندو عورتیں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔ حال ہی میں سپریم کورٹ نے اپنی رولنگ میں ہندو عورتوں کی شادی کو رجسٹرڈ کرنا لازم قرار دیا ہے۔ البتہ ابھی تک اقلیتوں کے خلاف موجودہ اقدام توہین رسالت کا قانون توجہ طلب ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے ریاست مفت تعلیم کا بندوبست کرے اور خصوصی اقدامات کرے۔ GDP کا کم از کم 10% خرچ کرے۔ عورتوں کی صحت کے لیے زچہ بچہ سنٹر، BHQ لیول پر لیڈی ڈاکٹر کی تعیناتی اور الٹراساؤنڈ اور مکمل اور محفوظ لیبر لوم کو یقینی بنایا جائے۔ عورتوں کو بریسٹ کینسر کے بارے میں جانکاری اور صحت کی سہولیات مفت فراہم کی جائیں۔

مذہبی جنونیت

گزشتہ چند سالوں میں مذہبی جنونیت کا اظہار جس طرح پاکستان کے جنوبی علاقوں اور قبائلی سرحدی علاقوں میں ہوا۔ اور اب جو پھیلا ہوا پورے معاشرے میں سرایت کر چکا ہے اس میں خاص طور پر عورتوں کی آزادی ان کی نقل و حرکت اور ان کی تعلیم پر جس قدر پر تشدد انداز میں قدغن لگائی گئی اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔

صرف قبائلی سرحدی علاقوں میں 400 زائد لڑکیوں کے سکول جلا دیے گئے یا انہیں بموں کے ذریعے تباہ کر دیا گیا۔ بچیوں لڑکیوں اور عورتوں جو گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگائی گئی انہیں زبردستی برقع پہننے پر مجبور کیا گیا۔ ان سے متعلقہ دکانیں اور بازار زبردستی بند کروا دیے گئے۔ پر تشدد واقع پر مبنی ویڈیو پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا جس میں ایک 16 سالہ لڑکی کو سرعام کوڑے لگائے گئے۔ بہت سی ایسی پر تشدد کہانیاں اور کارروائیاں منظر عام پر نہ آسکیں۔ نظام عدل کو قومی اسمبلی سے منظور کروا دیا گیا۔ جس میں جہاں شرعی نظام کے رائج کرنے کا مطالبہ قاضی عدالتوں کے قیام کا مطالبہ کیا گیا وہیں پر عورتوں سے متعلق بہت سی شخصی آزادیوں اور ان کے بنیادی حقوق کو غیر ترقی قرار دیا گیا۔ اس عرصہ میں ملک کے تمام طبقات سے تعلق رکھنے والی عورتوں کے لیے عملاً جدوجہد سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔

ماحولیات اور محنت کش عورتیں

اگرچہ پاکستان کا ماحولیات کی آلودگی میں معمولی حصہ ہے مگر اس کے قدرتی وسائل پر مضر اثرات اور حتمی نتائج کے اعتبار سے پاکستان 12ویں نمبر پر ہے۔ ایسا ملک جو معاشی اعتبار سے صنعتی زوال کا سامنا کر رہا ہے کسی بھی طرح سے قدرتی وسائل کی کمی کے اثرات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جو ساحلی علاقے، جنگلات کے قریب، پہاڑی علاقوں میں رہائش پذیر لوگ پانی کی کمی، جنگلات کی کمی، سرسبز چراگاہوں کے خاتمے، بارش اور موسمی تغیرات سے سب سے زیادہ متاثر ہوں گی۔ کیٹی بندر کی مثال ہمارے سامنے ہے جس کے ساحلی علاقوں میں مینگروز، جنگلی اور آبی حیات (مچھلی اور جھینگے) کی موت کی صورت میں ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ لاکھوں افراد بالخصوص عورتیں اپنے روزگار سے محروم ہو کر غربت کا سامنا کر رہے ہیں۔ ماہرین کے مطابق کسانوں، ماہی گیروں اور قدرتی وسائل پر انحصار کرنے والی عورتوں کے روزگار اور معاش کے تحفظ کے لیے حکومت پاکستان کو GDP کا 5% ماحولیات کو بچانے کے لیے خرچ کرنا ہوگا۔

مختلف مالیاتی تنظیموں اور بینکوں نے گزشتہ دہائی میں غربت کے خاتمے کے لیے مائیکرو کریڈٹ جیسی سکیموں کا اندھا دھند اجرا کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کو دیے جانے والے قرضوں کی واپسی 100 فیصد ہے۔ جس پر بھاری سود 24% کی شرح عائد کی جاتی ہے۔ صرف کشف فاؤنڈیشن نے گزشتہ 14 سالوں میں 10 لاکھ دیہی اور شہری علاقوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو 16 بلین روپے کے قرضے دیے۔ جو غریب عورتوں کو زندگی میں ایسی مثبت تبدیلی کی بجائے ڈپریشن اور مایوسی کے سوا کچھ نہ دے سکے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ عورتوں کو اپنے گھر کا سامان بیچ کر قرضوں کی قسطیں ادا کرنا پڑیں۔ ہم عالمی مالیاتی اداروں کی قرضہ سکیموں کے ساتھ ساتھ ان نام نہاد تنظیموں کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو عورتوں کو خوشحالی کا جھانسہ دے کر مزید غربت کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

جدوجہد کا راستہ

پاکستان روایتی، رجعتی اور پدرسری معاشرے میں اگر واضح تبدیلی لانا مقصود ہے تو سب سے پہلے یہاں کے ملکی، سیاسی اور معاشی نظام کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ان نظاموں کو از سر نو تشکیل دینا ہوگا جہاں مرد اور عورت کے درمیان صنف اور طبقاتی بنیادوں پر منظم جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا۔

پاکستان میں عورتوں کے حقوق کی تحریک کا آغاز 80 کی دہائی میں ضیاء کے کالے قوانین کے خلاف احتجاجی تحریکوں سے شروع ہوا جب انہوں نے عورتوں کے بنیادی حقوق اور کالے قوانین کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی۔ لیکن یہ تحریک اپنے اندر طبقاتی بنیادوں پر عورتوں کے خلاف ہونے والے معاشی جبر اور استحصال کے

خاتمے کے لیے عورتوں کو منظم نہ کر سکی۔ ملک کے اکثریتی محنت کش طبقے کی عورت کو دو محاذوں پر لڑنا ہوگا۔ سامراجی گلوبلائزیشن، غیر رسمی معیشت اور عورتوں کو محض شے سمجھ کر منافع کے لیے استعمال کے نتیجے میں عورتوں کے استحصال میں اضافہ ہوا ہے۔ عورتیں عورت دشمن سماجی ڈھانچوں سے باہر نکلنے کی کوشش تو کر رہی ہیں لیکن معاشی استحصال کا شکار بھی ہو رہی ہیں۔ یہ جنگ عورتیں اکیلے نہیں جیت سکتیں اسے وسیع تر محنت کش طبقے کے ساتھ مل کر منظم تحریکوں کا حصہ بن کر جدوجہد کرنا ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ صنفی اور جنسی بنیادوں پر ہونے والے استحصال کو روکنے کے لیے اپنی آزاد اور با اختیار انجمنیں، تنظیمیں بھی بنانا ہوں گی۔

سچے اور حقیقی انقلاب کے علمبرداروں کو شعوری طور پر اس تاریخی، حقیقت کو اپنے نظریات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے تسلیم کرنا چاہیے۔ ایک جمہوری سوشلسٹ سماج کے لیے زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کی باہمی شمولیت ضروری امر ہے۔ آج کا پاکستانی معاشرہ انقلابی تبدیلی کے لیے تیزی سے تیار ہو رہا ہے۔ محنت کش عورتیں تمام تر رجعتی ماحول اور طالبانائزیشن کے خوف کے باوجود پچھلی ایک دہائی میں شروع ہونے والی تحریکوں میں ہر اول دستوں میں چاہے وہ پاور لومز مزدوروں کی تحریک ہو یا پنجاب میں کسانوں کی تحریک ہے یا پھر وکلاء تحریک ہو محنت کش عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور ان تحریکوں کو کامیابی کی طرف لے جانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ حکمران طبقات کے مابین غیر حقیقی تضادات کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ جو بائیں بازو کی قوتوں کے لیے موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ان تضادات کو دائیں بازو کی رجعت پسند قوتوں کے خلاف استعمال کرتے ہوئے عوام کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کریں۔ یقیناً یہ مشکل کام ہے۔ اس جدوجہد میں ترقی پسند خیالات سے لیس عورتیں شعوری شمولیت کے ساتھ انقلاب کی منزل کو قریب تر کر سکتی ہیں۔

----☆----

مذہبی بنیاد پرستی ۔۔۔تاریخی جائزہ

بنیاد پرستی مذہب کو سیاسی رنگ دینے کا نام ہے

پاکستان دنیا میں دہشت گردی کی علامت بن چکا ہے۔ دوسرے ملک سے سیاح تو پاکستان کیا آئیں گے خود پاکستانی شہریوں کے لئے قبائلی علاقے اور ان سے ملحقہ اضلاع نو گو ایریاز بن چکے ہیں۔ تھانے اور چھاؤنیاں تک محفوظ نہیں۔ فوج نے اپنی حفاظت کے لئے پولیس تعینات کر رکھی ہے اور پولیس کی یہ حالت ہے کہ وہ باریش افراد کو دیکھتے ہی دوڑ لگا دیتی ہے۔ مساجد اسلحہ خانہ بن چکی ہیں جبکہ امام بارگاہوں کا رخ کرنا محاذ جنگ پر جانے سے کم نہیں۔

شہر میں داخل ہونے والے ان حملہ آوروں کے بارے بتایا جا رہا ہے کہ یہ بھارتی خفیہ ایجنسی را کے ایجنٹ ہیں حالانکہ چند ماہ پہلے کی بات ہے جب نومبر ۲۰۰۸ء میں لشکر طیبہ سے تعلق رکھنے والے بندوق برداروں نے بمبئی پر حملہ کیا تھا اور پاک بھارت جنگ کے خدشات زور پکڑنے لگے تھے، تو پاک فوج کے ایک ترجمان نے طالبان کو محب وطن قرار دیا تھا۔ پاک فوج اور اس کے پروردہ کالم نگار حضرات کے نت بدلتے بیانات سے طالبان میں بھی خاصی کنفیوژن پیدا ہوتی ہو گی، ہم آپ بھلا کیا نتیجہ اخذ کریں گے۔ کبھی ٹی وی مذاکروں کی میزبانی کرنے والے میزبان اور ان کے تجزیہ نگار مہمان حضرات طالبان کو اسرائیل کا ایجنٹ قرار دینا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی افراد پہلے طالبان کو مجاہد اسلام قرار دیا کرتے تھے۔

ایسے میں بہت کم آوازیں ایسی ہیں جو دوٹوک انداز میں، بغیر کسی لگی لپٹی کے یہ کہنے کی جرات رکھتی ہیں کہ طالبان نہ موساد نے بھیجے ہیں نہ را نے۔ یہ پاکستان کی اپنی پیداوار ہیں۔ ان کے بابا آدم جنرل ضیاءالحق تھے۔ انکی پرورش جی ایچ کیو اور آئی ایس آئی نے کی۔ انکی تعلیم و تربیت جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام اور تبلیغی جماعت کے ہاتھوں ہوئی جبکہ انکی تعلیم و تربیت کا بار سعودی عرب نے اٹھایا۔ اس سارے سلسلے کی نگرانی امریکہ نے کی جو ان سب کا آن داتا تھا۔

یہ کھیل 1978-79ء میں شروع ہوا اور 1988-89ء تک جاری رہا۔ مقصد اس کا فقط اتنا تھا کہ افغانستان کے اندر اپریل 1978ء میں آنے والے "ثور انقلاب" کا کام تمام کیا جائے۔ "ثور انقلاب" افغانستان کی اشتراکی جماعت "حزب دیموکراتیک خلق افغانستان" (پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان، پی ڈی پی اے) نے برپا کیا تھا۔ "ثور انقلاب" کے نتیجے میں آنے والی حکومت نے جاگیرداری کا خاتمہ، عورتوں کے حقوق، مفت تعلیم اور آزادانہ انتخابات کا وعدہ کیا۔ ان اعلانات سے جاگیردار اور مولوی حضرات بوکھلا گئے۔

ادھر یہ حکومت امریکہ مخالف اور سوویت روس کی حامی تھی۔ یہ سرد جنگ کا زمانہ تھا۔ امریکہ کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک میں ایسی حکومتیں قائم ہو جائیں جو سوویت روس کی حامی ہوں یا غیر جانبداری کی علمبردار۔ پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو تیسری دنیا کے ایسے بہت سے رہنماؤں میں سے ایک تھے جنہیں امریکہ کی نافرمانی پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اب جو امریکہ نے دیکھا کہ افغانستان میں سامراج مخالف حکومت قائم ہو گئی ہے جبکہ ایران میں اس کے پالتو شاہ ایران کا تخت بھی دھڑن ہونے والا ہے (ایک سال بعد شاہ ایران کو اپنا سونا تخت چھوڑ کر فرار ہونا پڑا) تو امریکہ نے افغانستان کے مولوی حضرات اور جاگیرداروں کی مالی معاونت اور عسکری تربیت شروع کر دی تا کہ وہ "ثور انقلاب" کو غیر مستحکم کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے پاکستان کو اگلے مورچے کی حیثیت حاصل تھی۔ پاکستان میں جنرل ضیاء کی قیادت میں فوج حکمران تھی۔ جماعت اسلامی ضیاء کی کابینہ میں شامل تھی۔ جنرل ضیاء نے بھی جنرل مشرف کی طرح جی جان سے امریکہ کی خدمت گزاری کی۔

ادھر جب سوویت روس نے دیکھا کہ امریکہ انکی حامی افغان حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے تو اس نے افغان حکومت کو بچانے کے لئے دسمبر 1979ء میں اپنی فوجیں افغانستان بھیج دیں۔ یہ فیصلہ کتنا صحیح یا غلط تھا، اس پر بہت سی بحث ہوتی آئی ہے۔ ہوا بہر حال یوں کہ افغانستان سوویت روس اور امریکہ کے مابین جنگ کا اکھاڑہ بن گیا۔ یوں افغانستان میں ایک ایسی جنگ شروع ہوئی جو مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آج بھی جاری ہے۔

پاکستان میں سرگرم تحریک طالبان پاکستان، فرقہ وارانہ تشدد میں مصروف سپاہ صحابہ، بھارت کے خلاف برسر پیکار جیش محمد و لشکر وغیرہ تیس سال سے جاری اسی افغان جنگ کا شاخسانہ ہیں لیکن انہیں محض افغان جنگ کی پیداوار قرار دینا درست نہیں۔ افغان جنگ نے انکو تیزی سے ترقی کرنے، پھلنے پھولنے اور پاکستانی معاشرے پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں کلیدی کردار ضرور ادا کیا ہے لیکن انکی نشوونما میں بہت سے دیگر عناصر بھی کارفرما ہیں۔ ان قوتوں کو یہ اثر و رسوخ کیسے حاصل ہوا، یہ کیوں محنت کش طبقے کی دشمن ہیں اور ان سے کیسے نپٹا جا سکتا ہے یہ سب جاننے اور سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان قوتوں کی فطرت اور کردار کا جائزہ لیں۔

یہ قوتیں صرف پاکستان میں ہی نہیں پائی جاتیں۔ امریکہ اور اسرائیل سے لیکر بھارت اور انڈونیشیا تک، مذہب (اسلام، عیسائیت، یہودیت یا ہندومت) کے نام پر مختلف قوتیں بزور بازو اپنی مرضی دوسروں پر لاگو کرنے یا حکومت پر کسی نہ کسی طرح قبضہ کرنے میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔ پُر تشدد سیاست میں مصروف یہ مذہبی قوتیں ایک سیاسی نظریے کا عملی اظہار ہیں۔ یہ نظریہ ہے "بنیاد پرستی"۔ ہم اسے مذہبی جنونیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سیاسی نظریے پر عمل پیرا گروہوں اور افراد کو ہم "بنیاد پرست" یا "مذہبی جنونی" کہتے ہیں۔ بنیاد پرستی مذہب کو سیاسی رنگ دینے، مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے، مذہب کی آڑ میں سیاست کرنے کا نام ہے۔ اس نظریے کے پیروکار بزور طاقت اپنا سیاسی نظام لاگو کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی سیاست کے پرچار کے لئے یہ

تاریخ کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ عیسائی، مسلم، یہودی، ہندو گویا سب بنیاد پرست اپنے مذہب کے کسی خاص دور کو "سنہرا دور" قرار دیتے ہیں۔ بنیاد پرستی معاشرے کو درپیش معاشی، سماجی، ثقافتی، سیاسی بحران کی وجہ مذہب سے دوری کو قرار دیتی ہے اور ان تمام مسائل کا حل یہ بتاتی ہے کہ تاریخ کے اس مجوزہ "سنہرے دور" کی طرف کو لوٹ جانا چاہئے جو در حقیقت کبھی موجود ہی نہ تھا۔ یہ مجوزہ سنہری دور متعلقہ مذہب کے ظہور یا سیاسی عروج کا دور ہوتا ہے۔ ماضی کی طرف لوٹ کر جانے کے اس نعرے کو وہ یوں پیش کرتے ہیں گویا وہ مذہب کی بنیاد کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے انھیں بنیاد پرست کہا جاتا ہے حالانکہ بعض حلقوں کی رائے یہ ہے کہ انھیں بنیاد پرست نہیں کہنا چاہئے کیونکہ یہ مذہب کی بنیادی باتوں کی نفی کرتے ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں: "بنیاد پرستی مذہب کے نام پر قوموں کی انتظامی اقتدار، معاشی وسائل اور سماجی اختیار پر قبضے کی سیاسی تحریک ہے جس کا مفروضہ مقصد جدید سیاسی ڈھانچوں، اجتماعی اداروں، سماجی رویوں اور فکری رجحانات کو رد کر کے معاشرے میں رہنما اصول کے طور پر مذہبی احکامات کی لفظی تشریح اور قدیم مذہبی روایات کی بالادستی قائم کرنا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ بنیاد پرستی کے لئے مذہبی جنونیت کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے یا عرب دنیا اور ایران میں "سیاسی اسلام" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یعنی اسلام کا سیاسی استعمال۔ مغربی دنیا میں فنڈامینٹل ازم (fundamentalism) کی اصطلاح عام ہے۔ بنیاد پرستی یا فارسی زبان میں بنیادگری دراصل فنڈامینٹل ازم کا ہی ترجمہ ہے۔

فنڈامینٹل ازم کی اصطلاح سو سال پہلے امریکا میں سامنے آئی تھی۔ ہوا یوں کہ جدید سائنسی رجحانات اور جمہوری آزادیوں سے پادری حضرات خائف ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ جمہوریت اور سائنس معاشرے پر ان کی اجارہ داری ختم کر دیں گے۔ انہوں نے فنڈامینٹلز کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا۔ اس کتابچے میں تلقین کی گئی کہ عیسائیوں کو سائنس اور جمہوریت کے جھمیلوں میں پڑنے کی بجائے انجیل سے رجوع کرنا چاہئے۔ یوں فنڈامینٹلز کے حامی فنڈامینٹلسٹ (بنیاد پرست) کہلانے لگے۔ یہاں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ بنیاد پرستی اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں گو بنیاد پرست ہمیشہ عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے یہ کوشش کرتے ہیں کہ بنیاد پرستی (یعنی ان کی سیاست) اور مذہب ایک ہی چیز ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔

اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی اور اسلام دو مختلف چیزیں ہیں۔ شیو سینا اور ہندومت ایک ہی سکے کے دو رخ نہیں۔ جماعت اسلامی مذہب کو استعمال کرتی ہے تا کہ اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کر سکے۔ اسی طرح شیو سینا ہندومت کا نام لے کر اپنی سیاست چمکاتی ہے۔ اس بات کو ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک شخص جو انتہائی مذہبی ہو، لازمی نہیں وہ بنیاد پرست بھی ہو۔ پاکستان میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو انتہائی مذہبی ہیں لیکن ووٹ وہ پیپلز پارٹی، اے این پی، ایم کیو ایم یا کسی بلوچ قوم پرست جماعت کو دیتے ہوئے نظر آتے

ہیں۔ گویا جس طرح مذہبی ہونا اور بنیاد پرست ہونا دو مختلف باتیں ہیں اسی طرح جماعت اسلامی یا جمعیت علمائے اسلام کی مخالفت اسلام کی مخالفت نہیں۔ بنیاد پرستی کی مخالفت مذہب کی مخالفت نہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بنیاد پرستی کی چند نمایاں خصوصیات پر نظر دوڑائی جائے۔

بنیاد پرستی کی خصوصیات

1: تاریخ بطور ہتھیار:

مذہب کے علاوہ بنیاد پرست جس ہتھیار کو سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں وہ ہے تاریخ۔ تقدیس دیہ ہے کردہ تاریخ پر منطقی یا سائنسی بحث کی بھی اجازت نہیں دینا چاہتے۔ ان کے ہاں مذہب کی طرح تاریخ کی صرف ایک ہی تشریح پائی جاتی ہے۔ تاریخ کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک مجوزہ طور پر "سنہرا دور" ہوتا ہے۔ دوسرا "زوال" کا دور ہوتا ہے۔ سنہرے دور بارے دعوی چین ہی چین لکھتا ہے جبکہ زوال کی وجہ مذہب سے دوری بتائی جاتی ہے۔ بنیاد پرست ہندو "رام راج" کو سنہرا دور قرار دیتے ہیں۔ بنیاد پرست یہودی حضرت داؤد کے عہد کو سنہرا دور قرار دیتے ہیں۔ مسلمان دے تعلق رکھنے والے بنیاد پرست ظہور اسلام سے خلفائے راشدین کے عہد تک اپنا سنہرا دور شمار کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے عہد میں بھی اسلامی تاریخ کی انتہائی جید شخصیات کی قیادت میں مسلمان باہم جنگ و جدل میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اوپر یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ بنیاد پرست قرطبہ اور بغداد کو اسلامی تہذیب کے اہم مراکز قرار دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی تہذیب میں ان دو شہروں کو اہم مراکز کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ دونوں مراکز خلفائے راشدین کے بعد تہذیبی مراکز بن کر ابھرے۔ اسی طرح اگر بغداد پر ہلاکو خان کی چڑھائی اور سپین سے مسلمانوں کے انخلاء کو "زوال" کا آغاز تسلیم کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت عین اس وقت عروج کی طرف گامزن ہو رہی تھیں جب غرناطہ کے مسلمان کشتیوں میں سوار ہو رہے تھے۔

بنیاد پرستی کی بیان کردہ تاریخ کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ چند فوق البشر ہستیاں، کوئی قہرمان (ہیرو) یا کوئی سورما نجات دہندہ بن کر آتا ہے یا آئے گا اور قوم کو ذلت سے نجات دلا کر "سنہرا دور" واپس لے آئے گا۔ عوام، مزدور، کسان ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کے خیال میں تاریخ عوام نہیں بناتے چند ہیروز (شہید اور غازی) یا "صالح فرد" (نیک و پرہیزگار لوگ) بناتے ہیں لہذا ان کی تاریخ اور سیاست میں شخصیت پرستی ایک اہم عنصر بن کر سامنے آتی ہے۔

2: سیاست بذریعہ طاقت:

بنیاد پرستوں کی ایک اہم نشانی یہ ہوتی ہے کہ ان کے ہاتھ میں ڈنڈا ہوتا ہے۔ یہ جمہوری انداز میں منطق اور دلیل کے ساتھ لوگوں کو قائل کرتے ہوئے اپنی بات نہیں منواتے۔ یہ ڈنڈے کے زور پر اپنی بات منواتے ہیں۔ یہ عوام کو قائل کرنے کی بجائے عوام سے اطاعت کرانے کے قائل ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے یہ طاقت کے ذریعے، ڈرا دھمکا کر، خوف اور دہشت پھیلا کر لوگوں کو اطاعت پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ جماعت اسلامی یا بی جے پی، سپاہ صحابہ اور شیوسینا ایسے گروہ انتخابات میں حصہ لیتے ہیں لیکن ان کی جمہوریت صرف انتخابات تک محدود ہوتی ہے یہ اس وقت تک جمہوریت پسند ہوتے ہیں جب تک یہ حزب اختلاف میں ہوتے ہیں۔

جمہوریت صرف انتخابات کا نام نہیں۔ جمہوریت سے مراد ہے اظہار رائے کی مکمل آزادی، سیاسی جماعتیں یا ٹریڈ یونین اور طلباء یونین بنانے کی آزادی، آزاد عدلیہ، سیاسی و معاشی فیصلوں میں عوام کی شراکت۔ بی جے پی ہو یا جماعت اسلامی، حکومت میں آتے ہی یہ جمہوری آزادیوں پر حملے شروع کر دیتے ہیں۔ ایران، سعودی عرب یا سوڈان ایسے ممالک میں یا جب افغانستان میں طالبان حکمران تھے، ہمیں کسی قسم کی جمہوری آزادی یا بنیادی انسانی حقوق دکھائی نہیں دیتے۔

3: اندرونی دشمن و بیرونی دشمن کا ہوا:

بنیاد پرست ہمیشہ کسی اقلیت کو اندرونی دشمن کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں مثلاً حضرت احمدیہ فرقے، مسیحی و ہندو اقلیت کو جبکہ بھارت میں بی جے پی اور سنگھ پریوار (بنیاد پرست ہندو جماعتوں کی برادری، بی جے پی اس کا محض ایک حصہ ہے) مسلمانوں کو پاکستان کا ایجنٹ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ اندرونی دشمن ہمیشہ ایک ایسی اقلیت ہوتی ہے جو اپنا مناسب دفاع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس اندرونی دشمن کو جواز بنا کر بنیاد پرست شخصی و جمہوری آزادیوں پر حملہ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لوگوں کے جذبات بھڑکا کر اپنی حمایت میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جوں جوں بنیاد پرستی کا اثر ورسوخ بڑھتا ہے، توں توں شخصی و جمہوری آزادیوں پر حملے تیز ہوتے جاتے ہیں اور بنیاد پرست اقلیت کی بجائے اکثریت کی طرف اپنی توپوں کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ پاکستان میں اس کی مثال ہم یوں دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلے احمدیہ فرقے کو نشانہ بنایا گیا۔ ستر کی دہائی میں احمدیہ فرقے کو غیر مسلم قرار دلوانے کے بعد، ضیاء آمریت کے عہد میں توپوں کا رخ مسیحی برادری کی جانب ہوا اور توہین رسالت کے نام پر قوانین بنا کر انہیں نشانہ بنانے کا عمل شروع ہوا۔ اس کے بعد سپاہ صحابہ سامنے آئی جس نے شیعہ فرقے کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ اب بریلوی اور دیوبندی لڑائی کا آغاز ہو چکا

ہے کراچی میں مساجد پر قبضے کے لئے سنی تحریک والے مختلف دیوبندی گروہوں سے لڑ رہے ہیں۔ خیبر ایجنسی میں 2006ء میں بریلوی دیوبندی لڑائی میں درجن بھر افراد ہلاک ہو گئے۔ کچھ عرصہ قبل لاہور میں مفتی سرفراز نعیمی کو ہلاک کیا گیا جس کا الزام طالبان پر لگایا گیا۔ اندرونی دشمن کے نام پر متشدد قوتیں کس طرح معاشرے پر اپنی گرفت مضبوط کرتی ہیں، اس کا بہترین اظہار ایک جرمن پادری نے اپنی ایک نظم میں کیا۔ جرمنی میں ایڈولف ہٹلر کی نازی جماعت نے یہودیوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ مختلف وجوہات کی بنا پر یورپ میں یہودیوں سے نفرت پائی جاتی تھی لہٰذا انہیں نشانہ بنا کر جرمن عوام کے جذبات بھڑکائے جا سکتے تھے۔ یوں ہٹلر نے اپنی حمایت حاصل کی۔

اندرونی دشمن کے ساتھ ساتھ بنیاد پرست کسی بیرونی دشمن کا ہوا بھی کھڑا کئے رکھتے ہیں۔ یہ دشمن حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور مفروضہ بھی۔ پاکستان میں ہر وقت بھارت اور بھارت میں ہر وقت پاکستان کو دشمن بنا کر پیش کیا، ایران میں اسرائیل اور اسرائیل میں ایران اور حماس کو دشمن بنا کر پیش کیا ان ملکوں کے بنیاد پرستوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ بیرونی دشمن کا ہوا کھڑا کر کے بنیاد پرست یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بیرونی دشمن سے لڑنے کی صلاحیت صرف ان کے پاس ہے لہٰذا ان کی قیادت میں سب متحد ہو جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اندرونی و بیرونی دشمن کا ہوا کھڑا کر کے بنیاد پرست مہنگائی، غربت، طبقاتی تفریق یا محنت کش اور سفید پوش طبقے کے اصل مسائل سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔

4: عورت دشمنی:

بنیاد پرست عورت پر مختلف پابندیاں لگا کر، اسے گھر کی چار دیواری میں فقط "ماں، بہن، بیوی" کے کردار میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی اس عورت دشمنی کو وہ روایات اور تقدس کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ عورتوں پر پابندی لگانے کے لئے اور ان کے حقوق غصب کرنے کے لئے وہ "بے حیائی اور فحاشی کا خاتمہ کرنے" کی آڑ بھی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی وہ ثقافت اور کلچر کی دہائی دیتے ہیں۔ عورت دشمنی کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ انہیں معاشرے کے کمزور حصے کو نشانہ بنانا ہوتا ہے۔ عموماً مذہبی اقلیتوں کے بعد عورتیں معاشرے کا کمزور طبقہ ہوتی ہیں۔ ان کو حقوق سے محروم کر کے وہ معاشرے میں موجود جمہوری و شخصی آزادیوں کا گلا دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا ایک معاشی فائدہ بھی ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں رہنا چاہیے، بنیاد پرست حکومتیں ملک کی آدھی آبادی کے معاشی فرائض سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ آج کے جدید معاشرے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ہر بالغ کو تعلیم، علاج اور روزگار مہیا کرنا حکومت اور ریاست کی ذمہ داری ہے۔ جب نصف آبادی کو گھر میں بند کر دیا جائے گا تو ریاست آدھی آبادی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئی۔

اس ضعف کی ذمہ داری متعلقہ خاندان کے مردوں پر آن پڑی۔ اس کا ایک سیاسی فائدہ بھی ہوتا ہے۔ ضعف آبادی کو گھر میں قید کرتے ہوئے بنیاد پرست احتجاج پر آمادہ ضعف آبادی کو اس کے جمہوری حق سے محروم رکھتے ہوئے اپنی سیاست آگے بڑھاتے ہیں۔

مذہبی اقلیتوں اور چھوٹی قومیتوں سے دشمنی: قومی حقوق اور بنیاد پرستی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہندو بنیاد پرست اکھنڈ بھارت کے قائل ہیں تو مولوی حضرات ایک اُمہ کے۔ ترکی اور عراق کے کردوں یا پاکستان کے بلوچ، بنیاد پرست کبھی ان کے حق میں آواز نہیں اٹھاتے۔ ایران میں بلوچ اور عرب قوموں کو دوسرے درجے کا شہری بنا کر رکھا گیا ہے اور قومی جبر کی کوئی حد روا نہیں رکھی گئی۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے جب اپنے حقوق کے لئے جدوجہد شروع کی تو جماعت اسلامی نے البدر اور الشمس نامی تنظیمیں بنا کر بنگالیوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ ترکی میں کردوں کی آزادی کے لئے لڑنے والی جماعت "پی کے کے" کا خاتمہ کرنے کے لئے ترک فوج کے ساتھ مل کر، ایران کی حمایت یافتہ حزب اللہ نے کارروائیاں کیں۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سعودی عرب میں حکمران آلِ سعود و آلِ عبدالوہاب، شیعہ فرقے اور ایران میں امام خمینی کے پیروکار سنی، بہائی اور یہودی و نصرانی آبادی کا ناطقہ تنگ کئے بیٹھے ہیں۔ اسرائیل کے یہودی بنیاد پرست عرب شہریوں کو حقوق دینے کے خلاف ہیں۔ بھارت میں سنگھ پریوار والے آئے روز مسلمانوں، عیسائیوں یا بدھ مت اور جین مت والوں پر حملے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان تمام خصوصیات کے باوجود بنیاد پرستی گذشتہ دو تین دہائیوں سے بہت تیزی سے پھیلی ہے۔ مسلم دنیا میں بالخصوص بنیاد پرستی کا ابھار ہوا ہے۔ ایران میں بنیاد پرست 1979ء سے حکمران ہیں۔ افغانستان پر پہلے مجاہدین پھر طالبان کی حکومت قائم ہو گئی۔ سعودی فرمانروا یوں تخت پر بیٹھے ہیں گویا ان کو کبھی زوال ہی نہیں آنا۔ سوڈان میں دو دہائیوں سے بنیاد پرست حکومت کر رہے ہیں۔ الجزائر میں وہ 1991ء کے عام انتخابات بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ ہمارے ہاں 2002ء میں ایم ایم اے نے ایک صوبے میں حکومت بنا لی۔ فلسطین میں حماس اور لبنان میں حزب اللہ کا ابھار ہوا۔ اور القاعدہ تو پوری دنیا میں ایک علامت بن کر ابھری۔ ترکی میں اس وقت بھی بنیاد پرستوں کی حکومت ہے اور وہ تین بار انتخابات جیت چکے ہیں۔ ہندوستان میں بی جے پی برسر اقتدار آ گئی۔ اسرائیل میں بنیاد پرست گروہ پندرہ فیصد تک ووٹ حاصل کرنے لگے۔ بنیاد پرستی کا یہ فروغ آخر کیوں؟

بنیاد پرستی کا فروغ

بنیاد پرستی کی ایک تعریف ہم یوں بھی کر سکتے ہیں کہ یہ تاریخ کا پہیہ الٹا گھمانے والا ایک ایسا سیاسی

عمل ہے جو جدت کی ضد ہے۔ یقیناً یہ ایک اہم سوال ہوگا کہ جدت کیا ہے؟ مولوی حضرات جدت کو مغرب کی نقل قرار دے کر اسے بے حیائی اور فحاشی کی صورت پیش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی ترقی کو جدت قرار دیں گے۔ بعض فرد، مغربی طرزِ جمہوریت، مغرب سے منسوب سیاسی نظریات اور مادی ترقی کو جدت قرار دیں گے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ترقی یا مغرب کے سیاسی نظریات کو ہم جدت کا اظہار تو کہہ سکتے ہیں لیکن یہ بذاتِ خود جدت نہیں۔ جدت کی تعریف سے قبل، جملہ معترضہ کے طور پر آیئے ذرا پہلے اس بات کا جائزہ لیں کہ مولوی حضرات 'مغرب زدہ' افراد یا 'فحاشی اور بے حیائی' کا شور کیوں مچاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں مغرب کی ایک روایتی تصویر پائی جاتی ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغرب میں اخلاقیات کو زوال آ چکا ہے وہاں ہر کوئی ہر کسی سے جنسی تعلقات قائم کر لیتا ہے، لوگ یا شراب خانوں میں پڑے رہتے ہیں یا ڈسکو فلور پر ناچ گانے میں مصروف۔ مستنصر حسین تارڑ اور عطاءالحق قاسمی ایسے رجعتی سفرنامہ نگاروں نے بھی اس قسم سوچ کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان سفرنامہ نگاروں کو کبھی یورپ کے عجائب گھر، کتب خانے، ٹریڈ یونین اور اخبارات، دانشور اور سیاسی کارکن نظر نہیں آتے۔ ان کو جامے سے باہر گھومتی عورتیں تو نظر آتی ہیں لیکن یہ کبھی بھی کسی کو نہیں بتاتے کہ رات کے بارہ بجے بھی کوئی عورت اکیلی جا رہی ہو تو اسے کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ان کو یورپی معاشرے کی تنظیم، تہذیب، سیاسی حقوق کبھی دکھائی نہیں دیتے۔ پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ جمال الدین افغانی سے لیکر امام خمینی تک سب کے سب سیاسی پناہ یورپ میں جا کر لیتے ہیں۔ مقصد یہاں یورپی اقدار اور معاشرے کی تعریف نہیں۔ سرمایہ داری نے یورپ اور امریکہ کو مختلف نوع کے مسائل میں جکڑ رکھا ہے اس سے بھی خطرناک یہ بات کہ امریکی و یورپی سامراج تیسری دنیا کے استحصال میں مصروف ہے۔ لیکن مغرب کے محنت کش طبقے اور حکمران طبقے میں فرق کرنے کی ضرورت ہے جس طرح پاکستان کے مزدور کسان نواز شریف یا آصف زرداری یا ان سے قبل جنرل مشرف کے فیصلوں کے ذمہ دار نہیں ہوتے اسی طرح یورپ کے عوام کا اپنے حکمرانوں کی جنگی حکمت عملی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے عراق جنگ کے خلاف سب سے بڑے مظاہرے بھی یورپ اور امریکہ میں ہوئے تھے، سعودی عرب، ایران یا پاکستان میں نہیں۔ اس بات چیت کا مقصد یہ کہنا تھا کہ مغربی معاشرہ ویسا نہیں جیسی تصویر ہمیں دکھائی جاتی ہے۔ مغرب میں محنت کش طبقے کو حاصل حقوق اور مراعات ہمارا حکمران طبقہ نہیں دینا چاہتا لہٰذا وہ مولویوں کے ساتھ مل کر مغرب کو بے حیا ثابت کرتے رہتے ہیں تا کہ بتایا جا سکے مغرب برا ہے، ہم غریب سہی لیکن عفت و آبرو اور غیرت کے پیرو ہیں۔ روٹی، روزگار، علاج، تعلیم، ووٹ کے حق کو چھوڑو، یہ دیکھو تمہاری مائیں بہنیں ڈسکو نہیں جاتیں، ان کے بوائے فرینڈ ان سے ملنے گھر نہیں آتے۔

عین یہی حربہ مولوی حضرات اپنے ناقدین پر آزماتے ہیں۔ جب مزدور ٹریڈ یونین بنانے کی کوشش کریں تو کہا جاتا ہے یہ کمیونسٹ، سوشلسٹ ہیں، دہریے ہیں۔ یہ مذہب کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تا کہ معاشرے

میں فحاشی اور بے حیائی پھیل جائے۔ ان سے بچو۔

عورتیں اپنے حقوق مانگیں تو کہا جاتا ہے یہ این جی اوز کی فیشن ایبل امیر عورتیں ہیں جو مغرب کی ایجنٹ ہیں۔ یہ ہماری بہو بیٹیوں کو خراب کرنا چاہتی ہیں۔ ان سے بچو۔ یوں ہے کہ مولوی حضرات (اور ان کی پشت پر کھڑے تھپکی دینے والے جاگیردار، سرمایہ دار حضرات) مخالفوں کو بے حیا قرار دے کر ان کو معاشرے کی کالی بھیڑیں ثابت کرتے ہوئے، ان کو متنازعہ بنا دیتے ہیں۔ یوں جب مخالفین مولوی حضرات سے کسی بھی بات پر اختلاف کریں تو عوام میں یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہ دراصل تو متنازعہ لوگ پیش کر رہے ہیں لہٰذا ان کی رائے بھی متنازعہ ہے۔ سو یہ ہے حقیقت مولوی حضرات کی انسداد فحاشی مہم کی۔ اب آیئے دیکھتے ہیں جدت سے کیا مراد ہے۔ معروف پاکستانی دانشور اقبال احمد مرحوم کے مطابق جدت ایک تاریخی عمل ہے جس میں معاشرے ایک طرز پیداوار سے دوسرے طرز پیداوار کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ان کے بقول ہمارے عہد میں یہ عمل زرعی طرز پیداوار سے سرمایہ دارانہ یا صنعتی طرز پیداوار کی طرف جانے سے عبارت ہے۔

تبدیلی کے اس عمل کے ساتھ ہی حکمران طبقہ بھی بدلنے لگتا ہے۔ جب سماج ایک عہد سے دوسرے عہد میں داخل ہوتا ہے تو انسانی اقدار بھی بدلنے لگتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے جب غلام داری سماج تھا تو آقا دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے غلام باقاعدہ جانوروں کی طرح قربان کیا کرتے تھے تا کہ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ جب دور غلامی ختم ہو گیا تو پھر ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ایک عہد سے دوسرے عہد میں پہنچ جانے سے اقدار ہی نہیں بدلتیں، مختلف طبقات کے مابین، عورت اور مرد کے درمیان، خاندان اور برادری کے درمیان حتیٰ کہ دو افراد کے درمیان تعلقات بدلنے لگتے ہیں۔ اس کی بہترین وضاحت یہ ہے کہ پاکستان کے وہ حصے جہاں سرداری اور جاگیرداری نظام طاقتور ہے وہاں یہ سب سماجی تعلقات کراچی، لاہور یا اسلام آباد میں پائے جانے والے سماجی تعلقات سے مختلف ہیں۔

جب نئے تعلقات جنم لے رہے ہوتے ہیں تو شناخت کا بحران پیدا ہوتا ہے۔ شناخت کے بحران کی ایک نمایاں مثال پاکستان سے یورپ یا امریکہ جا کر بس جانے والے افراد کی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ ان تارکین وطن کو جس طرح یورپی اقدار کے سامنے اپنی نئی شناخت بنانی ہوتی ہے اسی طرح ایسے معاشروں کو شناخت کے بحران کا سامنا ہوتا ہے جو ایک عہد سے دوسرے عہد میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں۔ چار سو سال پہلے یورپ میں جب جاگیرداروں کا زور ٹوٹنے لگا اور سرمایہ دار و صنعتکار طبقہ پیدا ہونے لگا تو یورپ بھی شناخت کے بحران سے گزرا اور نئے سماجی تعلقات نے بھی جنم لیا۔

ہوا یوں کہ جب فیکٹریاں لگنے لگیں تو کسان کھیت مزدوری چھوڑ کر فیکٹری کی چار دیواری میں کام کرنے لگے۔ اب کام کی جگہ کھیت نہیں کسی مل کا گودام یا ورکشاپ تھی۔ یوں تلاش رزق میں جب کسان فیکٹری

میں پہنچنے لگا تو گاؤں کی آبادی کم ہونے لگی، شہر کی بڑھنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اور عمل ہوا۔

پہلے گاؤں کا موچی جوتا بناتا تھا، لوہار اوزار ڈھالتا تھا، جولاہا کپڑا بنتا تھا یعنی استعمال کی اشیا بھی بہت کم مقدار میں بنتی تھیں۔ اب جو کپڑے کی مل لگی تو اس نے رات بھر میں اتنا کپڑا تیار کر دیا کہ جولاہا بے چارہ عمر بھر بھی نہ کات پاتا۔ اس صنعتی پیداوار نے اپنے لئے صارف بھی پیدا کرنے تھے۔ یوں نہ صرف کسان کی جگہ مزدور نے لی اور مزدور طبقہ پیدا ہوا بلکہ صارفین کا کلچر بھی پیدا ہوا۔ مزدور غریب ضرور تھا لیکن اسے معلوم پڑ گیا کہ وہ کسان کی طرح بے بس نہیں۔ اگر وہ ہڑتال پر چلا جائے تو مل بند ہو جاتی ہے۔ مزارع بے چارہ کہاں ہڑتال کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ جاگیردار کے سامنے سر نیچا کئے زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ بغاوت کر سکتا ہے لیکن ہڑتال نہیں۔ سو نہ صرف نئی اقدار بلکہ نئے سماجی تعلقات نے یورپ میں اپنے لئے جگہ بنانا شروع کی۔

جب معاشرہ ایک عہد سے دوسرے عہد میں داخل ہو رہا ہوتا ہے تو ایک عبوری عہد آتا ہے۔ اس عبوری عہد میں پرانا عہد دم توڑ رہا ہوتا ہے اور نیا عہد ابھی پوری طرح شروع نہیں ہوا ہوتا۔ اس عبوری عہد میں بدلتی ہوئی اقدار اور سماجی تعلقات کے حوالے سے تین طرح کے رجحان سامنے آتے ہیں۔

بنیاد پرست یا رجعت پرست رجحان:

یورپ میں اس کا اظہار Puritan Revolution کی صورت دیکھنے کو ملا۔ پیورٹن انقلاب ایک کوشش تھی گزرا ہوا زمانہ بزور طاقت واپس لانے کی۔ سولہویں صدی میں جب برطانیہ کے اندر اصلاح مذہبی کی تحریک نے بہت زور پکڑا تو بہت سے مسیحی گروہ تھے جو اس کے خلاف ہو گئے۔ مسلم دنیا کو اس بحران کا اس وقت سامنا کرنا پڑا جب یورپی سامراج نے اس پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اگر ہم ہندوستان کی مثال لیں تو نظر آتا ہے کہ دیوبند یا بریلی میں قائم ہونے والے مدارس انگریز سرکار کے لائے ہوئے نئے نظام سے بچنے کی ایک مذہبی کوشش تھی۔ بنیاد پرست یا رجعتی رجحان رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ نیکی اور پرہیزگاری پر عمل درآمد سے وہ آنے والی نئی آفت، نئے فتنے سے دامن بچا لیں گے۔

اصلاح پسند رجحان:

اس رجحان کے حامی اس سوچ کے قائل ہوتے ہیں کہ گزرے ہوئے عہد کی بہترین اچھی چیزوں کو بچا لو اور نئی تہذیب کی اچھی چیزیں اپنا لو۔ ایک مرتبہ پھر اگر ہندوستان کی مثال لیں تو اس اصلاح پسند رجحان کے ایک اہم ترجمان سرسید احمد خان کی صورت ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یورپ کی پروٹسٹنٹ فرقے کی تحریک اسی رجحان کی نمائندہ تھی۔

انقلابی رجحان:

یورپ میں اس رجحان کی بہترین مثال 1917ء میں روس میں آنے والا وہ انقلاب تھا جس کی مرکزی قیادت لینن اور ٹراٹسکی کر رہے تھے۔ مسلم دنیا میں ایسا انقلابی اقدام اتاترک نے اٹھایا اور ترکی سے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

مسلم دنیا کے کسی بھی ملک میں سرمایہ داری پوری طرح سے استوار ہو سکی ہے نہ نیم قبائلی و نیم جاگیردارانہ نظام پوری طرح سے ٹوٹ سکا ہے لہٰذا یہاں تیسری طرح کے رجحان وقتاً فوقتاً دیکھنے کو ملے۔ پچاس کی دہائی میں مصر کے جمال عبدالناصر، انڈونیشیا کے سائیکارنو، ایران کے ڈاکٹر مصدق، عراق کے عبدالکریم قاسم جیسے قوم پرست رہنما اصلاح پرست دھڑے کی شکل میں سامنے آئے۔ بعد ازاں پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو، الجزائر کے بن بیلا، بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمن وغیرہ اصلاح پسندی کے ترجمان بن کر ابھرے۔ ساٹھ کی دہائی میں ہم دیکھتے ہیں کہ انقلابی رجحان کی ترجمانی کرنے والی کمیونسٹ پارٹیاں مسلم دنیا میں بے شمار مقبولیت حاصل کرتی ہیں۔ اس وقت سوویت بلاک اور چین سے باہر دنیا کی سب سے بڑی اشتراکی جماعت انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ عراق میں سب سے بڑی جماعت کمیونسٹ پارٹی تھی اور عبدالکریم قاسم کمیونسٹ پارٹی کی مدد کے بغیر حکومت نہیں چلا سکتے تھے۔ افریقہ میں سب سے بڑی اشتراکی جماعت سوڈان کی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ پاکستان سے لیکر مصر تک، مراکش سے لیکر ملائشیا تک، کمیونسٹ پارٹیاں زبردست اثر و رسوخ کی حامل تھیں۔ ستر اور اسی کی دہائی میں جب اصلاح پسند اور انقلابی رجحانات نے مسلم دنیا میں دم توڑنا شروع کیا تو بنیاد پرست یا رجعتی قوتوں نے زور پکڑنا شروع کیا۔

ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیچھے بے شمار عناصر کارفرما تھے۔ بعض ممالک میں کچھ مخصوص مقامی عناصر بھی شامل رہے۔ تمام مسلم ممالک میں البتہ بنیاد پرستی کے فروغ میں کچھ مشترک عناصر متحرک نظر آئیں گے۔ ان عناصر کا جائزہ اگلے ابواب میں لیا جائے گا۔ یہ عناصر تھے:

۱۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کی جانب سے مسلم دنیا میں پھیلے بنیاد پرستی کے جال کو وسیع کرنے اور اسے مضبوط بنانے کے لئے تیل کی دولت (پیٹرو ڈالرز) کا استعمال۔ اس کا جائزہ دوسرے باب میں لیا گیا ہے۔ اس باب کا عنوان ہے: جہاد بذریعہ پیٹرو ڈالرز

۲۔ ایک طرف اگر فلاحی اور خیراتی اداروں کے انتہائی وسیع نیٹ ورک نے بنیاد پرستی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر ممالک میں سیاسی مفادات کے لئے حکمرانوں کی جانب سے مہیا کی جانے والی ریاستی سرپرستی نے بھی بنیاد پرستی کو پنپنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کا جائزہ تیسرے باب میں لیا گیا ہے جس کا عنوان ہے: بنیاد پرستی، فلاحی ادارے اور ریاستی سرپرستی۔

۳۔ آج بعض بنیاد پرست گروہ امریکی سامراج سے لڑتے نظر آتے ہیں یا کم از کم بیان بازی کی حد

تک امریکہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ سرد جنگ کے دوران یہ سب امریکی ڈالروں پر پلی رہے تھے۔ بنیاد پرستی نے سامراج کی گود میں پرورش پائی ہے۔ آج بنیاد پرستی جس طاقت کی حامل ہے یہ طاقت حاصل کرنا ممکن نہ تھا اگر اسے سامراج کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ اس امر کا جائزہ چوتھے باب میں لیا گیا ہے۔ اس باب کا عنوان ہے: سامراج بنیاد پرستی کی ماں ہے

۴۔ پچاس، ساٹھ اور ستر کی دہائی میں مسلم دنیا میں قوم پرست، سامراج مخالف یا بعض ممالک میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ کہلانے والے دھڑے وسیع بنیادوں پر عوامی حمایت رکھتے تھے۔ ان میں بعض کو سامراجی مداخلت کے ذریعے منظر سے ہٹا دیا گیا یا بعض نے عوام سے غداری کی اور سامراج سے سمجھوتے بازیاں کیں۔ جب ان ترقی پسند قوتوں نے میدان خالی کر دیا یا ان کو سامراج نے منظر سے ہٹا دیا تو قوم پرست، سامراج مخالف قوتوں کی عدم موجودگی میں پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو بنیاد پرستی نے پورا کیا۔

جہاد بذریعہ پیٹرو ڈالرز

بعض اندازوں کے مطابق اسلامی تنظیموں، جن میں سے بعض مسلح گروہ بھی ہیں، کے خزانے میں 5 تا 16 ارب ڈالر موجود ہیں جبکہ صرف سعودی حکومت اپنی وزارت مذہبی امور کے ذریعے 10 ارب ڈالر سالانہ بیرون ملک خرچ کرتی ہے۔ اس بات کا انکشاف اطالوی صحافی لوریتا ناپولیونی نے اپنی کتاب ''ماڈرن جہاد'' میں کیا ہے۔ سعودی فیاضی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلی صدی کے دوسرے نصف حصے میں سعودی پیسے سے دنیا بھر میں 1500 مساجد تعمیر کی گئیں۔ صرف بوسنیا میں سعودی امداد کا تخمینہ 15 ارب ڈالر لگایا گیا تھا۔ یہ امداد 1992ء میں آنا شروع ہوئی اور سعودی شہریوں اور سعودی حکومت نے اس مالی مدد میں حصہ ڈالا۔

ناقابل یقین؟ اگر سعودی پیسے سے تعمیر ہونے والے مدارس، مساجد اور امدادی اداروں پر نظر دوڑائی جائے جو سعودی پیسے سے پاکستان میں کھولے گئے تو یہ اعداد و شمار ایسے حیران کن یا ناقابل یقین محسوس نہ ہوں گے۔ اگر سعودی پیسہ وصول کرنے والے مولوی حضرات کا طرز زندگی دیکھا جائے تو بھی زیادہ حیرت نہ ہوگی۔ سعودی فراخدلی سے فیضیاب ہونے والی لشکر طیبہ کی مثال لیجئے جو اپنی فرنٹ تنظیم جماعت الدعوۃ کے ذریعے ''امدادی اداروں کا بہت بڑا نیٹ ورک چلا رہی ہے۔ ان اداروں میں 20 اسلامی ادارے، 140 سیکنڈری سکول، 8 مدارس شامل ہیں۔ ایک میڈیکل مشن کام کر رہا ہے جس کی مالیت 300000 ڈالر ہے اور اس مشن کے تحت موبائل کلینک، ایمبولنس سروس اور بلڈ بنک چلائے جاتے ہیں۔'' لاہور کے قریب موجود لشکر/جماعت کے ہیڈ کوارٹر کی تعمیر پر 50 ملین روپے کی لاگت آئی تھی اور اس ہیڈ کوارٹر میں ''ایک گارمنٹ فیکٹری، ایک آئرن فیکٹری، ایک ووڈ ورکس فیکٹری، ایک تالاب اور تین رہائشی کالونیاں موجود ہیں''۔ یہ پیسہ کہاں سے آیا؟ حافظ سعید کے بقول

''مخیر تاجران کے ایک گروہ نے مدد کی''، پھر ''احمد امی ایک سعودی تاجر تھا جس نے ایک کروڑ روپیہ دیا'' جبکہ ''ایک اور سعودی شیخ نے مزید پیسے دیئے جنکی مدد سے ہیڈکوارٹر میں دو بڑی ہال اسکول تعمیر کئے گئے''۔ صحافی عامر میر اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب میں انکشاف کرتے ہیں: ''کچھ اندرونی ذرائع کے مطابق جماعت کے پاس سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے وہابی ہمدردوں سے ملنے والے چندے اس قدر رقم جمع ہو چکی ہے کہ وہ اپنا بنک کھولنے کا ارادہ سوچ رہی ہے۔ ان ذرائع کا کہنا ہے کہ جماعت کی قیادت پورے پاکستان میں جائیدادیں خرید رہی ہے'' عامر میر کے مطابق: ''جماعت نے حال ہی میں لاہور کے گردونواح میں 300 ملین روپے کے پلاٹ خریدے۔ اسی طرح جماعت نے حیدرآباد ڈویژن (سندھ) میں چار پلاٹ خریدے جبکہ سندھ کے دیگر اضلاع میں چھ پلاٹ خریدے گئے۔ ان تمام سودوں کی مجموعی مالیت 250 ملین روپے تھی۔''

صرف سعودی حکمران ہی دیگر مسلم ممالک میں بنیاد پرستوں کی سرپرستی کے لئے فیاضی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ایران لبنانی تنظیم حزب اللہ کی مدد کرتا ہے جس کی تفصیلات عالمی پریس میں کئی بار شائع ہو چکی ہیں۔ صرف 1990ء میں، جب حماس کی پی ایل او کے متبادل کے طور پر پرورش کی جا رہی تھی، کویت نے حماس کو 60 ملین ڈالر کا چندہ دیا۔ حماس اس لحاظ سے دلچسپ تنظیم ہے کہ اسے ابن وہاب کے پیروکار بھی چندہ دیتے ہیں اور آیت اللہ خمینی کے نام لیوا بھی۔ ''مقبوضہ علاقہ جات میں حماس کا بجٹ 70 ملین ڈالر ہے۔ اس رقم کا 85 فیصد بیرون ملک سے آتا ہے۔ باقیماندہ اندرون ملک اکٹھا کیا جاتا ہے۔ ایران یا سعودی عرب سے وقتاً فوقتاً ملنے والی امداد سے حماس کو سالانہ 20-30 ملین ڈالر سالانہ ملتے ہیں (اپریل 2002ء میں سعودی عرب میں مقبوضہ علاقوں کے فلسطینیوں کے لئے ٹی وی مہم کے ذریعے 150 ملین ڈالر اکٹھے کئے گئے) لیکن چندے کا بڑا حصہ بیرون ملک مقیم فلسطینیوں یا سعودی اور دیگر خلیجی ریاستوں کے شہریوں سے ملتا ہے۔ 1998ء میں جب حماس کے رہنما شیخ احمد یسین کو اسرائیلی قید سے رہائی ملی تو وہ عرب ممالک کے چار ماہ کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ انہیں کسی قہرمان (ہیرو) کی طرح خوش آمدید کہا گیا اور اس دورے میں 300 ملین ڈالر جمع ہوئے۔''

ریگزاروں کی تہہ سے نکلنے والا تیل جب ڈالرز میں تبدیل ہوتا ہے تو اس عمل کے نتیجے میں بہت سی نوکریاں بھی جنم لیتی ہیں۔ مسلم دنیا سے تعلق رکھنے والے مزدور ان نوکریوں کے حصول کے لئے خلیجی ممالک کا رخ کرتے ہیں۔

طارق علی اپنی کتاب ''کین پاکستان سروائیو'' میں اس بابت یوں رقمطراز ہیں: ''اس حقیقت کے پیش نظر کہ مشرقی بنگال کی صورت ایک مقبوضہ منڈی پاکستان کے ہاتھ سے نکل گئی، ضروری تھا کہ کوئی متبادل تلاش کیا جائے۔ یہ متبادل تھا تیل سے مالا مال شیخ شاہیاں۔ یہ شیخ شاہیاں شکستہ پاکستان کی [illegible] ریاست کے لئے ایک واضح انتخاب تھیں لہذا نو بڑی مسلم ریاستوں یعنی ایران، عراق، ابوظہبی، دبئی، کویت، عمان، سعودی

عرب، لیبیا، اور انڈونیشیا کو پاکستان سے جانے والی برآمدات جو 1969-70 میں 6.6 فیصد تھیں وہ 1973-74 میں بڑھ کر 24.8 فیصد ہو گئیں''۔ اس حقیقت سے ہم یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ بھٹو ''اسلامی دنیا'' کے لئے بڑے سودائی کیوں بنے ہوئے تھے۔ کم از کم ایک اہم وجہ مسلم دنیا پر بھٹو حکومت کا معاشی انحصار بھی تھا۔ فرانسیسی محقق گائلز کیپل بتاتے ہیں کہ صرف 1983ء میں خلیجی ممالک میں کام کرنے والے پاکستانیوں نے 36 ملین ڈالر پاکستان بھیجے جبکہ اس سال پاکستان کو ملنے والی کل بیرونی امداد 375 ملین ڈالر تھی۔ خلیجی ممالک سے آنے والا سرمایہ جو وہاں مقیم پاکستانی محنت کش وطن بھیجتے ہیں آج بھی ملکی آمدن کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ سٹیٹ بنک کی ویب سائٹ پر مالی سال 2008 میں اس مد میں ہونے والی آمدن اس طرح بیان کی گئی ہے (تمام رقوم ملین ڈالرز میں ہیں):

سعودی عرب 1,251، عرب امارات 1,090، دبئی 661، ابوظہبی 298، شارجہ 28، دیگر 1.68، دیگر جی سی سی ممالک (کویت، بحرین، قطر، عمان 105)۔ اس کے برعکس برطانیہ سے اسی مد میں 458 ملین جبکہ یورپی یونین کی دیگر ریاستوں سے 176 ملین ڈالر وطن بھیجے گئے۔ خلیجی ممالک میں کام کرنے والے مسلم دنیا سے آئے لاکھوں مزدور، اسلام پر تحقیق کرنے والے محقق دلیپ ہیرو کے بقول ''سعودی عرب میں اپنی نجی نوکری کے دوران ان رجعتی نظریات سے بھی آشنا ہوتے ہیں جو وہاں عورتوں سے متعلق پائے جاتے ہیں (''عورت کو گھر کی چار دیواری میں رہنا چاہئے، اپنے مرد کی دیکھ بھال کرنی چاہئے'')، آرٹ کی آزادی سے متعلق پائے جاتے ہیں (''آرٹ کو مذہب سے اجتناب برتنا چاہئے'')، مسلم مسیحی تعلقات بارے پائے جاتے ہیں (''انہیں دوسرے درجے کا شہری بنا کر رکھا جائے'') یا اسلامی تہذیب پر مغرب کے اثرات بارے پائے جاتے ہیں (''مغرب سے آنے والی سیاسی و سماجی اختراعات اسلامی اقدار کی ضد ہیں'')۔''

روزگار کے ان مواقع کی وجہ سے اگرچہ ایشیا اور افریقہ کے مسلم ممالک کی حکومتوں کو وقتی سہارا ضرور ملتا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادیوں کو خلیجی جاب مارکیٹ کے ذریعے نوکری مل جاتی ہے یوں بے روزگاری پر کسی حد تک پاکستان، بنگلہ دیش یا مصر ایسے ممالک میں قابو پا لیا جاتا ہے لیکن یہ خلیجی ریلیف بغیر شرائط کے دستیاب نہیں ہوتا۔ جن ممالک کو خلیج میں اپنے شہریوں کے لئے نوکریاں درکار ہیں انہیں جواباً اپنے دروازے وہابی نظریات کے لئے کھولنا ہوتے ہیں جو مدرسوں، مسجدوں اور خیراتی اداروں کی صورت یلغار کرتے ہیں۔ پیٹروڈالرز سے چلنے والا نیٹ ورک (مسجد۔ مدرسہ۔ خیراتی ادارے) اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ مذہبی رجحان رکھنے والا ایک طبقہ جنم لے جو ''اسلامی بنکاری'' کا طلبگار ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب اسلامی بنکاری کسی ملک کا رخ کرتی ہے تو سعودی پیٹروڈالرز پر پلنے والے مولوی حضرات بلاسود بنکاری کے حق میں فتوے دیتے ہیں۔ جب ''ثور انقلاب'' کے بعد ''کیمونسٹ حکومت'' نے سود منسوخ کئے تو مولوی حضرات نے انکی یہ کہہ کر مخالفت کی کہ سود ادا نہ کرنا چوری کے

مترادف ہے۔

اس بنکاری کی وجہ سے ایک تو سعودی شہزادوں کو اپنے بنکاری کے کاروبار کے لئے گاہک مل جاتے ہیں دوسرا مسلم ممالک میں بنیاد پرستی کے فروغ کے لئے ایک مستقل ذریعہ آمدن میسر آ جاتا ہے۔ ملائشیا، مصر اور سوڈان میں اسلامی بنکاری نے بنیاد پرستی کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

بنیاد پرستی، فلاحی ادارے اور ریاستی سرپرستی

اطالوی صحافی لوریتا ناپولیونی لکھتی ہیں: ”صلیبی جنگوں کی صورت مغربی یورپ کے بھوکوں مرتے عوام کو ایک موقع ملا جس کے ذریعے وہ موت کے شکنجے سے نکل کر جنگ کے ذریعے کچھ مال غنیمت سمیٹ سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے پاس جنت کمانے کا بھی ایک موقع تھا جو ایک زبردست پیکج تھا“۔ ناپولیونی یہ اضافہ بھی کرتی ہیں کہ اس طرح ان خانہ جنگیوں پر بھی قابو پانے کی کوشش کی گئی جس نے یورپ کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ مسلم دنیا کے بہت سے نوجوان جو مذہب کے نام پر دہشت گردی کرتے پھر رہے ہیں، ان کی اکثریت غریب خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ قیادت میں ضرور سفید پوش یا بعض امیر لوگ نظر آئیں گے لیکن سپاہیوں کی اکثریت غریب محلوں، پس ماندہ دیہات اور جھونپڑ پٹیوں سے آتی ہے۔ غربت اور بنیاد پرستی میں ایک گہرا رشتہ ہے۔

جب غربت عام ہو اور حکومتیں عوام کو تعلیم، روزگار اور علاج ایسی بنیادی ضروریات فراہم کرنے میں ناکام ہو رہی ہوں تو بنیاد پرست قوتوں کے لئے آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ ان حالات میں بنیاد پرست قوتوں کے زیر اہتمام چلنے والے فلاحی ادارے عوام کی توجہ، ہمدردی اور حمایت حاصل کرنے میں انتہائی بنیادی کردار کرتے ہیں۔ امریکہ کے عیسائی بنیاد پرست ہوں یا بھارت کی شیوسینا، فلسطین کی حماس ہو یا پاکستان کی جماعت اسلامی، مذہبی جماعتوں اور بنیاد پرست گروہوں کے اسکول (مدارس)، ہسپتال، خیراتی ادارے اور پھر ان سب اداروں چلانے کے لئے افرادی قوت کو ملنے والا روزگار، ان کے اثر و رسوخ میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ اگر مسلم دنیا کی بات کی جائے تو نظر آئے گا کہ مراکش سے انڈونیشیا تک، جہاں بھی بنیاد پرستی کو فروغ حاصل ہوا فلاحی اداروں کا کلیدی کردار وہاں موجود تھا۔

پاکستان سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔ یہاں ریاست قومی بجٹ کا دو فیصد بھی ٹھیک سے خرچ نہیں کرتی۔ بچوں کی بہت بڑی تعداد اسکول ہی نہیں جا سکتی۔ ایسے میں غریب ماں باپ یہ سوچ کر بچے کو مدرسے بھیج دیتے ہیں کہ ایک تو اسے روٹی ملتی رہے گی، دوسرا مدرسے کے بعد اس کا روزگار کسی نہ کسی مسجد کی صورت میسر ہو جائے گا۔ معذور بچوں کو بھی یہی سوچ کر مدرسہ بھیج دیا جاتا ہے کیونکہ ریاست معذور افراد کا خیال نہیں رکھتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر خودکش بمبار مدرسوں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہیں سے مذہبی جماعتیں اپنے کارکن حاصل کرتی

ہیں۔ مدرسے مذہبی جماعتوں کی نرسری ہیں۔ پاکستان میں مدرسوں کا بہت بڑا نیٹ ورک ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 15,843 رجسٹرڈ مدارس ہیں: پنجاب 5,355، سندھ 2,852، پختونخوا 1,242، بلوچستان 297، وفاقی دارالحکومت 120 (ڈیلی ٹائمز، 7 اگست 2009)۔ اصل صورتحال ان سرکاری اعداد و شمار سے مختلف ہے کیونکہ مدارس کی بہت بڑی تعداد رجسٹرڈ نہیں ہے۔ دلیپ ہیرو نے 40,000 مدارس کی بات کی ہے۔ صرف کراچی کی بات کریں تو رجسٹرڈ مدارس 1000 مگر کل مدارس 3000 ہیں (بحوالہ: ڈیلی ٹائمز 29 اگست 2009 The ticklish question of sex education). ان مدارس میں پندرہ لاکھ کے لگ بھگ طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ مدارس میں کس قدر ترقی ہوئی، اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1947ء میں ملک اندر فقط 189 مدارس تھے (بحوالہ: No room for doubt and division by Kamila Hayat دی نیوز 25 ستمبر 2008) اور اب تعداد ہزاروں کو چھو رہی ہے۔

پاکستان کی طرح مصر میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی عناصر کا پھیلایا ہوا فلاحی جال بہت بڑا ہے۔ ہم مصر کی سب سے بڑی اور اہم جماعت اخوان المسلمین کی بات کرتے ہیں۔

1940ء میں اخوان المسلمین کی 500 شاخیں تھیں۔ ہر شاخ کا ایک اپنا مرکز تھا، ایک مسجد، ایک اسکول، ایک کلب یا گھریلو صنعت کا مرکز تھا۔ اخوان اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی (بعد ازاں فوجی) تربیت دی جاتی۔ مختلف مذہبی فلاحی اداروں کی تعداد 1994ء تک 2000 ہو چکی تھی۔ ان اداروں کے تحت چلنے والے اسکولوں، ہسپتالوں اور یوتھ کلبوں سے چھ ملین (60 لاکھ) افراد مستفید ہو رہے تھے جبکہ اس وقت مصر کی کل آبادی تیس ملین تھی گویا آبادی کا پانچواں حصہ ان خیراتی و فلاحی اداروں سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔

یہی حالت پڑوسی ملک فلسطین میں ہے۔ مارٹن کرامر، جو اسرائیل فلسطین تنازعے پر نظر رکھتے ہیں کا کہنا ہے کہ حماس لحد سے مہد تک فلسطینیوں کا خیال رکھتی ہے۔ غزہ اسلامک یونیورسٹی، جس کی بنیاد 1978 اخوان المسلمین نے رکھی، میں 5000 طلباء پڑھتے ہیں۔ ملائشیا کی بات کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دار ارقم ای ایک چھوٹے سے گروہ کس قدر مالی وسائل رکھتا ہے۔

1968ء میں دار ارقم نے ایک فرقے کی صورت جنم لیا۔ اس فرقے کے بانی اشعری محمد تھے۔ اس کے اراکین مخصوص لباس پہنتے۔ انہوں نے اپنے 40 گاؤں بسائے۔ ان گاؤں میں 200 اسکول، فلاحی ادارے اور شفا کرنے والوں کے لئے ”اسلامی طریقہ علاج“ والی علاج گاہیں بنائی گئیں۔ حلال گوشت کے لئے اپنے پراسیسنگ یونٹ لگائے گئے۔ ان گاؤں میں ٹی وی، کرسیاں اور میز ممنوع تھے۔

1995ء تک دار ارقم کے اراکین کی تعداد 10,000 اور ہمدردوں کی تعداد 200,000 ہو چکی تھی۔

اس کے تجارتی اثاثوں کی مالیت کا تخمینہ 120 ملین ڈالر لگایا جا رہا تھا۔ اور یہ انقلاب ایران سے قبل ایران میں 20,000 وقف املاک مولوی حضرات کی ملکیت میں تھیں۔ تیونیشیا ہو یا وسط ایشیائی ریاستیں، بنگلہ دیش ہو یا انڈونیشیا، لبنان ہو یا اردن اور عراق، کسی مسلمان ملک کا نام لیں، ایسے ہی وسیع فلاحی نیٹ ورک کام کرتے نظر آئیں گے۔

ریاستی سرپرستی:

مسلم دنیا میں کوئی ایک بھی ملک نہیں جہاں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوں۔ ترکی، پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈونیشیا ہی ایسے ملک ہیں جہاں جمہوری تجربات ہوئے ہیں۔ چالیس اور پچاس کی دہائی میں ایران اور مصر میں بھی جمہوری انداز میں انتخابات ہوئے یا جمہوری آزادیاں میسر رہیں۔ ایک طرف مسلم دنیا کے محنت کش، مزدور، کسان اور عام عوام مسلسل جمہوریت اور جمہوری آزادیوں کے لئے قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ دوسری طرف مسلم دنیا کا حکمران طبقہ مسلسل مذہب کے نام پر جمہوریت کا قتل کرتا آیا ہے۔ اپنے غیر جمہوری اقتدار کا جب کوئی جواز تو چاہیے ہوتا ہے لہٰذا یہ مذہب کی آڑ میں چھپ لیتے ہیں۔ مثلاً جب سعودی عرب میں جمہوریت اور اصلاحات کا مطالبہ زور پکڑنے لگتا ہے تو شاہ فیصل ہوں یا شاہ فہد، ان کا بیان ہوتا ہے کہ ہمارا آئین قرآن ہے ہمیں کسی اور آئین کی ضرورت نہیں۔ ایران میں رہبر اعلیٰ کو نائب اللہ کا درجہ حاصل ہے جسے براہ راست خدا سے ہدایات وصول ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں جنرل ضیاء الحق استخارہ کرتے اور بھٹو کو پھانسی دے دیتے یا قومی اسمبلی توڑ دیتے تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ غیر منتخب آمر ہی نہیں، منتخب عام قوم پرست رہنما بھی جب سیاسی مشکلات کا شکار ہوئے تو وہ مذہب کا سہارا لیتے۔ اس کی دو افسوسناک مثالیں مصر کے رہنما جمال عبدالناصر اور پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو۔ جب حکومت مذہب کے نام پر کی جائے گی یا سیاست کو آگے بڑھانے کے لئے مذہب کا استعمال ہوگا تو سیدھی سی بات ہے مذہبی حلقوں کو خوش کرنا پڑے گا۔ انہیں مادی رشوت بھی دینا ہوگی اور ان کے مطالبات بھی ماننا پڑیں گے۔ یوں ریاستی سرپرستی میں بنیاد پرستی کو آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ کسی بھی مسلمان ملک کی تاریخ اور سیاست کا تجزیہ کر لیجئے، یہ عمل بہت واضح نظر آئے گا کہ ریاستی سرپرستی نے معاشرے کو بنیاد پرستی کی طرف دھکیل دیا۔

سامراج بنیاد پرستی کی ماں ہے

گیارہ ستمبر کے بعد ایک طرف تو سرمایہ دار مغربی میڈیا نے اسامہ اور ملا عمر کو مسلم دنیا کا چے گویرا اور فیدل کاسترو بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی دوسری طرف پاکستان کے سرمایہ دار میڈیا میں موجود طالبان اور اسامہ کے حامی کالم نگاروں، تجزیہ نگاروں اور ٹی وی مذاکروں کے میزبانوں نے انہیں امریکہ مخالف ہیرو بنا کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ یہ بات بہر حال ایک حقیقت بھی ہے کہ پچھلے عرصے میں القاعدہ اور طالبان امریکہ سے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر صرف گیارہ ستمبر کی بات کی جائے تو ایک اندازے کے مطابق امریکی حکومت

کو 135 ارب ڈالر کا نقصان ہوا جبکہ ایک اور اندازے کے مطابق یہ نقصان 70 ارب ڈالر تھا۔ 900 ملین ڈالر تو خطا کرائے کی مد میں جڑواں میناروں سے ماہانہ بنیاد پر حاصل ہوتا تھا (جو لوگ اس واقعے کو ایک سازش قرار دیتے ہیں انہیں سوچنا چاہئے کہ اتنا بڑا نقصان اٹھانے والے خود ہی یہ سازش کرنے والوں کو معاف کرتے؟)۔ اور یہ گیارہ ستمبر کے بہانے امریکہ نے افغانستان اور بعد ازاں بغیر کسی بہانے کے ہی عراق پر دھاوا بول دیا تو طالبان اور القاعدہ ان حملوں کے خلاف صف آرا نظر آئے۔ یہ درست ہے کہ گیارہ ستمبر سے قبل بھی سعودی عرب، یمن، کینیا حتیٰ کہ امریکہ کے اپنے اندر القاعدہ نے امریکی مفادات کو نشانہ بنایا لیکن میڈیا کی ہاؤ ہو میں اب کبھی کسی نے طالبان کی بابت یہ یاد نہیں دلایا کہ کبھی چچا سام اور امیر المومنین ملا عمر اخوند کے مابین بھی گہری رسم و راہ تھی۔ اب نہ تو نیو یارک ٹائمز اور سی این این کو یاد ہے نہ ہی کبھی بی بی سی تذکرہ کرتی ہے کہ جب طالبان نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی "شریعت" نافذ کر دی تھی تو امریکی محکمہ خارجہ کے ترجمان گلین ڈیویز نے کہا تھا کہ طالبان کی اندرون ملک پالیسیوں میں کوئی "قابل اعتراض" بات نہیں۔ اور یہ جنگ، جیو اور نوائے وقت میں بھی کبھی کوئی یہ بتاتا سنائی نہیں دیتا کہ طالبان کو وائٹ ہاؤس کے بھیجے ہوئے ڈالرز غیر اسلامی نہ لگتے تھے نہ ہی امریکی آئل کارپوریشن یونوکول کی 25 ملین ڈالر کی وہ رشوت جو "چندے اور تحائف" کے نام پر دی گئی (یونوکول کے نائب صدر کرس ٹیگارٹ نے کہا تھا ہمارے نزدیک طالبان کی فتح مثبت قدم ہے)۔ ہاں کبھی کبھار افغان "جہاد" یا اسامہ کے اس انٹرویو کا ذکر تو آ جاتا ہے جو انہوں نے خبر رساں ادارے اے ایف پی کو 1998ء میں دیا تھا ("اسلحہ امریکہ بھیجتا تھا، پیسہ سعودی عرب سے آتا تھا") لیکن ان محبت بھرے خطوط کی کوئی بات نہیں ہوتی جو چچا سام کابل پر قابض طالبان کو ارسال کرتے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ سامراج اور بنیاد پرستی کے مابین جنم جنم کا ساتھ ہے۔ دونوں کے بیچ میں تضادات کم اور اتفاق رائے زیادہ ہے۔ سامراج اور بنیاد پرستی دونوں جمہوریت کے دشمن ہیں۔ دونوں کا کمیونزم سے جنم جنم کا بیر ہے۔ دونوں ترقی پسند عرب قوم پرستی کی تحریک کا شاخسانہ سمجھتے ہیں۔ دونوں ٹریڈ یونین کی تعمیر کے خلاف ہیں۔ دونوں ڈنڈے اور طاقت کے استعمال پر یقین رکھتے ہیں۔ دونوں محنت کش طبقے کو محکوم بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں دولت کی منصفانہ تقسیم کے خلاف ہیں۔

سامراج کی لڑائی بنیاد پرستی سے نہیں۔ وہ چند نافرمان بنیاد پرستوں کو سزا دینا چاہتا ہے۔ ریاض میں بیٹھے بنیاد پرستوں کی حفاظت کے لئے تو اس نے اپنی فوجیں تعینات کر رکھی ہیں۔ اور یہ سعودی عرب اور اس کے اڑوس پڑوس میں موجود شیخ شاہیاں بھی سامراج کے خلاف نہیں۔ طالبان اور القاعدہ سمیت دنیا بھر کی بنیاد پرست تنظیموں کو چندے دینے والی یہ ریاستیں برطانوی سامراج کے سائے تلے پروان چڑھیں۔ جب امریکی فوجوں نے عراق پر چڑھائی کی تو آیت اللہ سیستانی نے فتویٰ جاری کیا کہ امریکی فوجوں کی مزاحمت نہ کی جائے۔ دوسری

عالمی جنگ کے بعد جب انگلینڈ بوڑھے ہو گئے اور ان کے فرائض منصبی کا بوجھ چچا سام نے اپنے کندھوں پر اٹھایا تو تمام بادشاہ اور نمازی پرہیزگار سلطان امریکہ کی مالا جپنے لگے۔ خلیج میں آل سعود و آل الوہاب امریکہ کے اتنے ہی فرمانبردار اور قابل بھروسہ حواری ثابت ہوئے ہیں جتنے اسرائیل یا ہوتی۔

رہا آیت اللہ حضرات کا ایران تو یہ "کبھی ہاں کبھی ناں" کی حکمت عملی پر کاربند رہا (بوقت ضرورت امریکہ سے گٹھ جوڑ کر لیا، جب سیاسی مشکلات کا سامنا ہوا تو امریکہ مخالفت شروع کر دی)۔ اسلام پرست سوڈانی حکومت نے امریکی ڈالرز کے لالچ میں اپنے معزز مہمان اسامہ بن لادن کو نکال باہر کیا۔ ترکی کے پہلے اسلام پرست وزیر اعظم نے عہدہ سنبھالتے ہی تل ابیب کا رخ کیا۔ رہی پاکستان کی جماعت اسلامی تو بھٹو کو پھانسی لگوانے کے لئے جماعت نے سیاسی جلاد کا کردار ادا کیا۔ اس کے کارکن بھٹو مخالف تحریک میں "امریکہ زندہ باد" کے نعرے لگاتے سنائی دیے۔ پاکستان ہی نہیں، سرد جنگ کے دوران پوری مسلم دنیا میں اشتراکی، جمہوری، قوم پرست اور ترقی پسند قوتوں کا قلع قمع کرنے کے لئے امریکی اور یورپی سامراج نے بنیاد پرستی کی آبیاری کی، بنیاد پرستوں کے ساتھ مل کر کمیونسٹوں، ترقی پسندوں اور قوم پرستوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

ترقی پسندی کا زوال = بنیاد پرستی کا عروج

دوسری عالمی جنگ میں فاشسٹ قوتوں کو شکست دینے میں سوویت روس نے جو کردار ادا کیا، اس کے باعث سوشلسٹ نظریات مزید مقبول ہو گئے۔ انقلاب روس کے فوری بعد ہی سوویت روس نے آزادی کے لئے متحرک قوموں کی حمایت کر کے اپنے لئے یورپی نوآبادیات میں پہلے سے عزت کا مقام حاصل کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس یورپ کی لبرل پارٹیوں یا لبرل پارٹیوں نے کبھی کھل کر قومی آزادی کی تحریکوں کی حمایت نہ کی لہذا قدرتی بات تھی کہ قوم پرست سوشلزم کا نام لینے لگے۔ ویسے بھی یہ سوشلسٹ پیغام کہ سب انسان برابر ہیں، سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ ہونا چاہیے، انسان کو اپنے مذہبی و سیاسی عقائد پر عمل درآمد اور اسکے پرچار کی مکمل آزادی ہونی چاہیے گویا ایسی باتیں تھیں جو ہر اس انسان کو متاثر کرتی ہیں جو آزادی، امن، برابری کا حصول اور استحصال، ظلم، جبر، جنگ، ناانصافی یا عدم برابری کا خاتمہ چاہتا ہو۔ مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور محروم طبقات میں ایسے نظریات کو ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اگر پیر وارث شاہ اور بلھے شاہ کی کافیاں عوام میں تفسیر مودودی سے لاکھوں گنا زیادہ مقبول ہیں تو اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ صوفی حریت، اخوت، برابری اور جبر کے خاتمے کی بات کرتے ہیں جبکہ مفتی اسٹیٹس کو کے حامی ہیں جو جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراجی جبر کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

آزادی اور برابری کے حصول کی اس سیاسی جدوجہد کا نام ہی سوشلزم ہے۔ قومی آزادی کی تحریکوں کو مقبول بنانے کے لئے لگ بھگ پوری تیسری دنیا میں قوم پرست قیادت نے سوشلزم کا نعرہ لگایا۔ عوام نے لبیک

کہا۔ ملا نے سخت مخالفت کی۔ مفتی نے فتوے جاری کئے۔ سب بے سود۔ انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک، امریکی و یورپی سامراج سے آزادی اور سوشلزم کی صورت مساوات کا قیام ایک ایسا خواب تھا جو ہر آزادی پرور آنکھ میں سجا ہوا تھا۔ کتنے ہی جوان جسم تھے جو آزادی اور مساوات کی اس جدوجہد میں کام آئے۔ آزادی ملی بھی مگر اجالا داغ داغ تھا اور سحر شب گزیدہ۔

ایک کے بعد ایک ملک میں، سامراج مخالف اور قوم پرست قیادت یا تو خونی سامراجی مداخلت کے نتیجے میں ناکام ہو گئی یا ان قیادتوں نے سامراج سے گٹھ جوڑ بنا لیا۔ کہیں عوام سے غداری کی نتیجہ زوال پزیر ہو کر غیر مقبول ہونے لگیں۔ جوں جوں یہ قوتیں ناکام ہوتی گئیں، توں توں بنیاد پرستی آگے بڑھتی گئی۔ اس عمل کی بہترین تجسیم تو خود پاکستان ہے۔

اقلیتیں اور جبر

گوجرہ کی کرسچن کالونی اور نزدیکی گاؤں کوریاں میں 30 جولائی کی شب اور یکم اگست کو مسیحی کمیونٹی کے سینکڑوں گھر لوٹ مار کے بعد جلائے جانے اور ایک گھرانے کے چھ افراد کو زندہ جلا ڈالنے کے واقعات کو ریاستی اداروں، پنجاب حکومت کے ذمہ داروں اور اخبارات، نیوز چینلوں نے قرآن پاک کی توہین کے الزامات، فرقہ وارانہ اور گروہی چپقلش کا شاخسانہ قرار دینے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کھلی کتاب کی طرح نظروں کے عین سامنے موجود حقائق اتنے واضح ہیں کہ معاملہ کی اصل نوعیت کی پردہ پوشی اب آسان نہیں۔

خوفناک حقیقت جو ان واقعات کی چھان بین سے سامنے آئی وہ یہ ہے کہ پاکستان کے ریاستی ادارے ان واقعات میں ملوث دہشت گردی کی بالواسطہ چشم پوشی اور پشت پناہی میں اب بھی مصروف ہیں۔

گوجرہ، کوریاں اور نزدیکی علاقے کے واقعات سے متعلق حقائق نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ واقعات گزشتہ تین دہائیوں سے افغانستان اور پاکستان سمیت دنیا بھر میں جہاد کے نام پر دہشت گردی میں مصروف گروہوں کے خاتمہ کیلئے امریکہ، ناٹو اور حکومت پاکستان کی حالیہ کارروائیوں سے براہ راست جڑے ہوئے ہیں۔ بادی النظر میں ان کا پہلا مقصد نام نہاد جہادی دہشت گردوں کے خاتمہ کیلئے جنگی کارروائیوں میں مصروف حکومت پاکستان، امریکہ اور ناٹو اتحادیوں کو دباؤ میں لانا اور دوسرا مقصد دہشت گردوں کی سرگرمیوں سے عموماً لاتعلق رہنے والے عام مسلمانوں میں سے ریڈیکل عناصر کو تلاش کر کے اپنے ساتھ جوڑنا اور حقائق سے لاعلم مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا دکھائی دیتا ہے۔

کوریاں اور نزدیکی علاقے کے دیہات میں مسیحی کمیونٹی کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کیلئے قرآن کی توہین اور توہین رسالت کے الزامات کو لے کر اشتعال انگیزی کی مہم چلانے اور دہشت گردی کی کارروائیوں کی قیادت

کرنے کیلئے سپاہ صحابہ اور سنی تحریک ملوث پائی گئیں۔ سپاہ صحابہ دہشت گردی کے الزام میں کالعدم قرار دیا جا چکی ہے جبکہ سنی تحریک کو وزارت داخلہ نے اسی الزام میں زیر نگرانی تنظیموں کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔ بہمنی والا کے واقعہ میں مقامی مسجد کے پیش امام اشتعال انگیزی سے ملوث رہے اور قریبی گاؤں مان والا میں سنی تحریک کی مسجد سے شام کے وقت اعلانات کیے گئے۔ "عیسائیوں نے رسول اللہ کی توہین کرنے کی جرأت کی ہے جو مسلمان رسول اللہ کو مانتا ہے وہ مسجد میں آجائے۔" مسلسل اعلانات کے باوجود محض سو کے لگ بھگ افراد مسجد میں جمع ہوئے جن میں سے اکثر کا تعلق قاری لطیف کی سنی تحریک سے تھا جبکہ عینی شاہدوں کے مطابق متعدد اجنبی چہروں کو بھی اس اجتماع میں دیکھا گیا۔ بعض پستولوں سے مسلح تھے اور بعض نامعلوم لوگ کولا ڈرنک کی بوتلوں میں پیٹرول بم بنا کر لائے جن کی تعداد سو سے زائد تھی۔ گوجرہ میں کرسچن کالونی سے ملحقہ مسلم آبادی کی مسجد سمیت شہر کی تمام مساجد کے منتظمین اشتعال انگیزی سے ملوث رہے اور صرف چند مدرسوں سے ملحقہ مسجد سے اعلانات ہوتے رہے۔ مذکورہ مساجد اور مدرسوں پر کالعدم سپاہ صحابہ کے کارکنوں کا کنٹرول ہے۔ کوریاں میں آتشزدگی کے بعد 31 جولائی اور یکم اگست کی درمیانی شب اعلانات میں شدت آئی اور مسلسل یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ "مسلمانو اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دو اور صبح کوٹھاں والا چوک میں ہونے والے اجتماع میں آؤ۔ انجمن تاجران نے کوریاں گاؤں میں قرآن کی توہین کے ثبوت حاصل کر لئے ہیں۔ اسلامی غیرت کا ثبوت دو اور امریکہ کے ایجنٹوں کو سبق سکھا دو۔" یہ اعلانات یکم اگست کی صبح بھی جاری رہے حتیٰ کہ مقامی مسلمانوں نے خوفزدہ ہو کر بعض مسیحیوں کو فون کر کے کہا کہ "ان لوگوں کے ارادے ٹھیک دکھائی نہیں دیتے آپ اپنی حفاظت کا بندوبست کر لیں۔" تمام تر اشتعال انگیزی کے باوجود یکم اگست کوٹھاں والا چوک میں چند سو افراد ہی اکٹھے ہوئے جن میں مدرسوں کے طالب علم، اساتذہ اور مساجد کے پیش اماموں کے پیروکار اور سپاہ صحابہ اور سنی تحریک سمیت بعض انتہا پسند گروہوں کے سرگرم کارکن شامل تھے جبکہ گوجرہ کے عام شہری عملاً اس سرگرمی سے الگ تھلگ رہے۔ مسیحی بستی کے گھیراؤ کے بعد گاڑیوں میں بھر کر لائے گئے پراسرار نقاب پوش بھی کارروائی میں شریک ہو گئے، جنہوں نے کالی بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ جدید سنائپر گنوں، دو دو ماؤزروں اور آتش گیر کیمیکل سے مسلح تھے اور نہایت منظم انداز میں پوزیشن لے کر کارروائی کر رہے تھے۔

مسیحی آبادی پر حملے کے ان واقعات میں شریک عام مسلمانوں کو "انعام" دینے کیلئے دہشت گردوں کا نشانہ بننے والے مسیحیوں کے گھروں میں منظم لوٹ مار کرائی گئی۔ بہمنی والا میں گھروں کو جلانے کیلئے پٹرول بم استعمال کیے گئے تھے جو زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئے جس کے بعد گوجرہ میں آتشزدگی کیلئے ویسا ہی آتش گیر کیمیکل استعمال کیا گیا جو اس سے پہلے میریٹ ہوٹل اور پشاور کے پرل کانٹیننٹل ہوٹل میں آتشزدگی کیلئے استعمال کیا گیا

تھا۔ اس کیمیکل سے لگنے والی آگ واقعہ کے دو دن بعد بھی بھڑک رہی تھی۔ ایک گھر میں پھینکے گئے کیمیکل کا جلنے سے بچ جانے والا مواد متاثرہ گھرانے کے افراد کے پاس اب بھی موجود ہے۔

بہمنی والا کے واقعہ کے بعد علاقہ کے بعض ذرائع نے بتایا کہ سنی تحریک کے لیڈروں کے بعض جہادیوں سے مراسم ہیں جن کا تعلق لشکر طیبہ سے ہے۔ گوجرہ میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث افراد کے لیڈر قدیر اعوان اور مسجد اللہ اکبر مہدی محلہ کے پیش امام قاری نصر اللہ کے بارے میں علاقہ کے لوگوں نے بتایا کہ ان کے القاعدہ اور لشکر جھنگوی کے ساتھ روابط ہیں اور لال مسجد آپریشن کے دوران پاکستانی اور غیر ملکی جہادیوں کو ان کے ہاں آتے جاتے دیکھا جاتا رہا تھا۔

ضرورت ہے کہ ایسے تمام متعصبانہ قوانین کو ختم کیا جائے جن سے پاکستان میں بسنے والی اقلیتیں دوسرے درجے کی شہری بن کر رہ گئی ہیں۔

مذہبی جنونیت کا خاتمہ کیسے ممکن ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ امریکی حکومت دنیا کی سب سے بڑی دہشت گرد حکومت ہے اور وہ ملکی و عالمی سطح پر محنت کش طبقات کے خلاف ایک محاذ بنائے ہوئے ہے۔ وہ دنیا میں غربت، بھوک، افلاس، بے روزگاری، دہشت گردی، فرقہ واریت، غیر جمہوری رویوں اور سیاسی و سماجی و مسلکی جبر کے ذمہ دار ہیں۔ باراک اوباما نے اپنی انتخابی مہم کے دوران یہ واضح کیا تھا کہ وہ ڈرون حملے جاری رکھے گا اور اسامہ کی تلاش میں پاکستان کے اندر بھی جائے گا۔ پاکستان بارے سوچ رکھا ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان افواج امریکی ہدایات کے مطابق دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر فوجی آپریشن جاری رکھے گا، وہ خود بھی حملے کرتے رہیں گے اور فوجی حملوں کے دوران فوج کی ختم ہوئی ساکھ کو بہتر کرنے کی کوشش کی جائے گی تا کہ وہ اسی طرح وہی کام کر سکیں جو پچھلے 60 سالوں کے 32 سالوں میں کرتے رہے ہیں یعنی اقتدار پر فوجی قبضہ۔ ایسی صورت میں امریکی سامراج اس قسم کی آمریت کی ایک دفعہ پھر مکمل حمایت کرے گا یہ اس کا ماضی تھا اور یہی اس کا مستقبل ہے۔

پاکستان میں فوجی آپریشنز کسی بھی صورت مذہبی جنونیت کے خاتمے کا باعث نہیں بن سکتے نہ ہی پشتن سٹائل ملٹری حل اس اہم مسئلہ کا کوئی حل نکال سکتا ہے۔ مذہبی جنونیت ایک نئی قسم کی فاشسٹ طاقت ہے جو مذہب کے نام پر دہشت گردی کے ذریعے عوام کو ذہنی مفلوج کر کے اپنا "اسلامی اقتدار" حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مذہبی جنونی اربن ٹیررزم سے کام لے رہے ہیں۔ وہ گوریلا انداز کی کارروائیاں کر رہے ہیں اور چھپ کر حملہ کرتے ہیں۔ فوجی آپریشن کی حکمت عملی فوجی پیش قدمی ہے اور علاقوں پر قبضہ کرنے کی حکمت عملی ہے یعنی گوریلا انداز کی کارروائیوں کا جواب پوری آبادی پر قبضہ کر کے دیا جا رہا ہے۔ ایک مختلف انداز کی حکمت عملی کا

جواب ایک ایسے انداز سے دیا جا رہا ہے جو اس سے میل نہیں کھاتا۔ مذہبی دہشت گردی کا جواب علاقوں پر قبضہ، بمباری، ٹینکوں سے چڑھائی اور گولہ باری سے نہیں دیا جا سکتا۔ گوریلا سرگرمیوں کو براہ راست فوجی سرگرمیوں سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

مذہبی جنونی فرقہ واریت کا خاتمہ اس صورت ہی ممکن ہے جب اس سوچ کو ختم کیا جائے جو مذہبی جنونیت کو سہارا دیتی ہے، اس کو مضبوط کرتی ہے، اس کو جلا بخشتی ہے۔ مذہبی جنونیت ایک سیاسی اظہار ہے ہنگامہ خیز انداز کا جس میں جنون عقل کی تمام حدوں کو پار کر کے کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ یہ جنون ''جنت'' میں جانے کا ہوا ''جنجیوں'' کو پار کر دیگا، اس کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔

مذہبی جنونیت مقامی و عالمی حالات کی وجہ سے پھیلی ہے۔ فوجی آمریتوں کے دنوں میں امریکی سامراج کی پشت پناہی اور براہ راست امداد سے یہ جنونی عوامی سطح پر پھیل گئے۔ ان کی نظریاتی تربیت گاہوں یعنی مدرسوں کو ریاستی پشت پناہی حاصل تھی۔ یہ جنونیت اس لیے پھیل گئی کہ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ ن اور ق اور دیگر جماعتیں عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے میں ناکام ہو گئے۔ یہ اس لیے پھیل گئی کہ امریکی سامراج نے براہ راست ان کو فوجی آپریشن کا نشانہ بنایا ان کو ٹارگٹ کر لیا اور ملکوں پر قبضے کر لئے۔ عراق و افغانستان پر امریکی قبضہ جنونیت کے رہنے کے جواز کو فروغ دیتا ہے۔ جنونیت اس لیے بھی پھیل گئی کہ سماج کو جدیدیت میں داخل کرنے کی بجائے پرانے سماجی رشتوں کو قائم و مضبوط رکھا گیا۔ سرمایہ دار کا مزدوروں سے غلاموں والا سلوک اور جاگیرداروں کا کسانوں اور مزدوروں سے غیر انسانی سلوک بھی مذہبی جنونیت کے پھیلنے کا باعث بنا۔

معاشرہ میں پھیلی ہوئی رجعتی روایات، انحصار کرنے والی سوچ اور جہالت بھی مذہبی جنونیت کے پھیلاؤ کا باعث بنی۔ یہ وہ معاشرہ ہے جہاں زکوٰۃ کے نام پر دیا جانے والا پیسہ مذہبی اداروں کے خزانوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جہاں کینسر کا علاج پھونکوں سے کیا جاتا ہے۔ جہاں مسائل حل نہ ہونے کو ''نظر لگنے'' سے تعبیر کیا جاتا ہے جہاں بابوں کی ایک بڑی تعداد ''بری نظروں'' کو اتارنے میں لگی ہوئی ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جہاں بخار کا علاج ڈاکٹر کی بجائے پیر فقیر کرتے ہیں۔ جہاں پڑھے لکھے لوگ اپنی کاروں کے پیچھے کالا کپڑا باندھ لیتے ہیں تاکہ دوسروں کی بری نظر سے نہ لگ جائے۔ یہ توہمات سے بھرپور معاشرہ ہے جہاں حکمران طبقات توہمات کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ جہاں نجومیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کتنی دیر اور اقتدار میں رہیں گے۔

جب تک ایسی سوچوں کو بدلا نہ جائے گا مذہبی جنونیت کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے اکثر لبرل حلقے شارٹ ٹرم لانگ ٹرم کی حکمت عملی کا فارمولا پیش کرتے ہیں۔ مذہبی جنونیت کا خاتمہ ان دونوں قسم کی حکمت عملیوں کا مراحل میں تقسیم کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں بارے کہا یہ جاتا ہے کہ فوری مسئلہ تو جنونیت کو ختم کرنے

کا ہے لہٰذا شارٹ ٹرم حکمت عملی فوجی آپریشن کی ہے۔ لانگ ٹرم حکمت عملی میں ڈویلپمنٹ کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی جنونیت ایک معاشی مسئلہ نہیں ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ اسے سیاسی انداز میں ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا نظریاتی انداز میں جواب دیا جا سکتا ہے۔ پاکستان اور امریکی سامراج کی شارٹ ٹرم اور لانگ ٹرم حکمت عملی دونوں غلط ہیں۔ نہ ہی فوجی آپریشن اس کا حل ہے اور نہ ہی ڈویلپمنٹ اس کا حل ہے۔ اس کا حل تو مذہب کو ریاست سے آزاد کرنے میں مذہبی آزادی کی ضرورت ہے۔ مگر کسی ایک مذہب یا اس کے فرقے کی ریاستی حکمرانی اس مسئلہ کو مزید گھمبیر بنا دیتی ہے۔

ہم لانگ ٹرم اور شارٹ ٹرم حکمت عملی کی وکالت کرنے والوں کے جواب میں ایک انقلابی پروگرام پیش کرتے ہیں۔ مذہبی جنونیت کا خاتمہ ایک انقلابی پروگرام سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ یہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کے بس کی ہی بات نہیں۔ وہ تو ایسے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی پارٹیاں ہیں جو خود مذہبی ریاست کو چلانا چاہتے ہیں بس تھوڑا مختلف انداز میں۔

----☆----

پاکستان میں قومی سوال

پاکستان کی شکل میں درحقیقت ایک ایسی انوکھی ریاست تشکیل دی گئی جس کے مقاصد عالمی سرمایہ داری نظام اور اس کے مفادات کی اس خطے میں نگہبانی کرنا تھا۔ جس فوج نے انگریز کی کئی سال خدمت کی اس کو بھی نوازنا تھا اور جاگیردار و سرمایہ دار جو سامراجیت کے اچھے خدمت گزار تھے ان کو بھی انعام دینا مقصود تھا۔ اہم ترین بات ہندوستان کو ایک حقیقی عوامی جمہوری قومی آزادی اور سامراجیت مخالف کیمپ میں جانے سے روکنا اور آئندہ کئی سالوں کیلئے غلام رکھنا تھا۔ اس صورتحال میں ظاہر ہے کہ قومی حقوق، قوموں کی آزادیاں، عوام کے جمہوری حقوق، جمہوری روایات، فلاحی ریاستی تصور، سیکولر و ترقی پسند خیالوں کی ترویج جیسی ہر چیز ریاست کے مفادات کے خلاف تھی۔ ریاست پر قابض دونوں حکمران سویلین و فوجی ٹولہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح لوگوں کو کوئی حقوق دیئے جائیں۔ اگر یہ حقوق کسی حد تک ملے بھی ہیں تو یہ عوام کی زبردست عوامی، جمہوری، قومی و طبقاتی جدوجہد کی وجہ سے ملے ہیں۔ کبھی بھی ریاستی حکومتی طریقہ کار سے عوام کو کسی قسم کے کوئی حقوق نہیں ملے۔

پاکستان کی پوری تاریخ عوام کی طرف سے جمہوری طبقاتی و قومی حقوق و روایات کو بحال کرنے اور حکمرانوں کی طرف سے انکو غصب کرنے کی تاریخ ہے۔ جب بیوروکریسی کی طرف سے جب ملک چلایا نہ جاسکا تو فوجی آمریت نافذ کر دی گئی اور وہی فوجی آمریت و در پردہ ان کے ادارے ہماری ملکی داخلی و خارجی پالیسی، سیاسیات، ثقافت، تہذیب و ملکی قدروں کو طے کرتے رہے۔ مذہب کے نام پر گمراہ کرنے کی روایات جو عالمی سامراج نے ہندوستان میں شروع کیں ان کو پاکستان میں عالمی سامراج کے پٹھوؤں نے من و عن جاری رکھا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ، جو حقیقت میں ایک فرقہ پرست دائیں بازو جماعت تھی نے ہندوستان میں قوموں یعنی صوبوں کے تضادات کو خوب استعمال کیا وہ صوبوں کی خودمختاری (Provincial Autonomy) کی چیمپئن بن کر آئی۔ اس طرح سندھ و دیگر صوبوں میں اس نے حمایت حاصل کی۔ خاص طور پر سندھ کی ممبئی سے علیحدگی کے سوال پر۔ اس جماعت نے جب پاکستان کی قیادت کی تو وفاق کی جمہوری صورت اور صوبائی خودمختاری وغیرہ کے سوال کو بالکل رد کر دیا۔ درحقیقت اس عمل سے ان کے جو سامراجی و سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ مقاصد تھے وہ حاصل نہیں ہو سکتے تھے یا اس میں رکاوٹ ڈالی جاتی۔ بنگال میں پہلی مرتبہ 1948ء میں ہی زبان کے مسئلے پر دنگے فساد ہوئے کیوں کہ یہ کہا گیا کہ اردو اسلامی اور پاکستان کی زبان ہوگی باقی سبھی زبانیں غیر اسلامی ہیں۔ بنگالیوں نے اس حوالے سے سخت ردعمل ظاہر کیا اور بڑے مظاہرے ہوئے۔ اسی طرح پہلی مرتبہ لوگوں کا جب اسلامی بھائی چارہ ٹوٹا تو ان کو اپنے قومی و جمہوری حقوق بھی یاد آگئے۔

مسلم لیگ کے دو قومی نظریے اور آل انڈیا کانگریس کے ایک قومی نظریے درحقیقت تاریخ میں

ہندوستان میں تشکیل پانے والی قوموں کی تہذیب، ثقافت و تاریخ سے انکار پر مبنی تھے اور وقت نے یہ ثابت بھی کر دیا۔ مسلم لیگ نے زبردستی دو قومی نظریے کی بنیاد پر سندھیوں، پنجابیوں، بنگالیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کے قومی وجود سے انکار کیا اور یہ کہا کہ پاکستان میں فقط مسلم قوم ہے۔ باقی قوموں کی جو بات کرتا ہے وہ غلط ہے اور صوبائیت و نفرت پھیلاتا ہے وغیرہ۔ پاکستان میں مسلسل فوجی مداخلت کی وجہ سے آئین بھی نہ بن سکا۔ جو بھی آئین بنے وہ جرنیلوں نے ختم کر دیے۔ 1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے جو آئین بنوایا وہ بھی حقیقی عوامی جمہوری روایات سے انکار اور قومی حقوق کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا تھا، مگر اس کو بھی ختم کر دیا گیا۔ بنگالیوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے لیے دو یونٹ بنائے گئے اور اس طرح ون یونٹ کا المناک باب شروع ہوا۔ درحقیقت ون یونٹ کے بعد ہی حقیقی طور پر بنگال کے ساتھ باقی قوموں میں بھی قومی حقوق کی تحریک شروع ہوئی۔ ون یونٹ کے خاتمے نے بنگالیوں کی زوردار قومی حقوق کی تحریک کو جنم دیا اور باقی صوبوں میں بھی قومی حقوق کی تحریک شروع ہوئی۔ سندھ میں طلبہ کی '4 مارچ تحریک' اسی تحریک کا ایک سنہری باب ہے۔

عوامی لیگ شیخ مجیب کی سربراہی میں ایک قومی حقوق کی نمائندہ جماعت بن کر ابھری۔ اس نے سندھ، بلوچستان و سرحد کے قوم پرستوں سے بھی رابطے کیے۔ جب عوامی لیگ نے انتخابات میں اکثریت حاصل کرلی تو اس کا مینڈیٹ تسلیم نہیں کیا گیا اور اس کے خلاف آپریشن شروع کیا گیا جو آخر بنگلہ دیش کی آزادی پر ختم ہوا۔ عوامی لیگ کوئی علیحدگی پسند جماعت نہ تھی بلکہ وہ قومی حقوق کی بات کر رہی تھی۔ 30 لاکھ بنگالیوں کو شہید کر دیا گیا اور ہزاروں عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ قومی حقوق مانگنے کی سزا دی گئی۔ اور اس طرح جیسا ایک اصول طے ہوا کہ ملک اگر دو ٹکڑے ہو جائے تو بھی قومی جمہوری حقوق تسلیم نہیں کرتے۔ بنگلہ دیش کے سانحے کے بعد ہی سابق مسلم لیگی رہنما اور قوم پرست رہنما جی ایم سید نے 1972ء میں سندھ کی آزادی یعنی 'سندھو دیش' کا مطالبہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں پارلیمانی جمہوری طریقہ کار سے کسی قسم کے جمہوری حقوق حاصل کرنا مشکل ہے اور اس طرح انہوں نے پاکستان میں انتخابات میں حصہ لینے سے بھی انکار کر دیا۔

پاکستان کو ایسی ریاست بنا دیا گیا ہے جہاں جمہوری انتخابات ناممکن ہیں۔ فوجی آمریت بار بار آکر یہاں معمولی سے معمولی جمہوری کلچر کو تباہ و برباد کر جاتی ہے۔ اس طرح کا عمل ہر سویلین حکومت کے ساتھ جبر کا رہا جس نے جمہوریت کی طرف پیش رفت کی۔ بورژوا جمہوری رہنماؤں بینظیر بھٹو شہید اور نواز شریف کو سیکیورٹی رسک کہا گیا۔ اصل میں سیکیورٹی رسک تو یہ فوجی جرنیل تھے جنہوں نے ملک کے عوام کو تو بار بار فتح کیا مگر ہر مرتبہ بیرونی محاذ پر شکست حاصل کی۔ ان کی پوری تاریخ اس طرح کے اعمال سے بھری ہوئی ہے۔ ملک کو اگر کوئی خطرہ رہا ہے تو بھی انہی کی وجہ سے اور اگر ملک ٹوٹا ہے تو بھی انہی کے دور میں۔ پاکستان میں جب کسی نے قومی حقوق کا مطالبہ کیا ہے اسے غدار اور ہندوستانی ایجنٹ تسلیم کیا گیا ہے اور سخت قسم کے پروپیگنڈے کیے گئے ہیں۔ اس

پروپیگنڈا نے عوام کو گمراہ رکھا۔ سندھ میں آپریشن ہوا، بلوچستان میں عوام کو بے بنیاد پروپیگنڈا سے گمراہ رکھا جاتا ہے۔

پاکستان میں قومی سوال کی اہمیت و نوعیت

مسلسل غیر جمہوری ادوار و فوجی آمریت نے پاکستان میں قومی جذبے کو باقاعدگی سے ابھارا ہے۔ پاکستانی فوج میں پنجاب کی عددی اکثریت کی وجہ سے باقی تمام قومیں استحصال کا شکار رہی ہیں اور فوج میں پنجابیوں کی اکثریت کی وجہ سے انہوں نے آمریت میں بھی مراعات حاصل کی گئیں۔ یہاں کی قومی تحاریک زیادہ تر پنجاب مخالف رہی ہیں اور ملک میں جمہوری و قومی حقوق کو غصب کرنے کے عمل میں پنجاب کو ذمہ دار قرار دیتی رہی ہیں۔ سندھ میں خاص طور پر پنجابیوں اور پنجاب کے خلاف نفرت کے جذبات موجود رہے ہیں۔ جن کو قوم پرست قوتوں نے زیادہ ابھارا ہے۔ قوم پرستوں نے اکثر بات کو نظر انداز کیا ہے کہ در حقیقت فوجی آمریت ہی قومی آزادیوں اور جمہوریت کی مخالف ہے اور وہی سب حقوق غصب کرتی ہے۔

سندھ میں قوم پرستوں کا ایک گروہ خود فوجی اسٹیبلشمنٹ وغیرہ اداروں کا ہی تشکیل شدہ ہے جو پنجابیوں اور پنجاب کو گالی دے کر فوجی حکمرانوں کا شسٹم ٹولے کو بچاتا رہا ہے۔ اس ہی گروپ نے سندھ میں کمیونسٹوں کے خلاف سخت مزاحمت کی ہے۔ اس گروہ کی خواہش یہ رہی ہے کہ عام حقیقی تضاد کی طرف توجہ نہ جائے بلکہ ان نفرت پنجاب کی طرف رہے تا کہ خود پنجاب میں یہ پروپیگنڈا کیا جا سکے کہ دیکھیں پاکستان میں پاکستان کی سالمیت کے لیے خطرہ ہیں۔

فوجی آمریت نے فقط اس طرح کے گروہوں کو ہی سیاست کی اجازت دی ہے جو سندھ کی بھی درسگاہوں میں سرگرم رہے اور خود بھی سندھ کی تعلیم، شعور و عقل کو تباہ و برباد کرتے رہے۔ ان کو ہتھیار بھی فوجی آمریتوں کے ادوار میں ہی دیے گئے تا کہ اپنی دہشت کے زور پر ہر قسم کی انقلابی سیاست کو روکا جا سکے۔ ساور کیمونسٹ رہنما ڈی ایس ایف کے سربراہ کامریڈ نذیر عباسی پر انہی قوم پرست عناصر نے سندھ کے بھی تعلیمی اداروں میں داخل ہونے پر پابندی لگا دی تھی۔ جب نذیر عباسی اس پابندی کو رد کرتے ہوئے سندھ یونیورسٹی میں گئے تو ان کو آرٹس فیکلٹی میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

سندھ دیگر اقوام کو پاکستان اور اسلام کے نام پر لوٹ کھسوٹ کا شکار کیا گیا۔ یہاں کے صنعتی اداروں میں پنجاب سے لوگ بھرتی کیے گئے۔ باقاعدہ پنجاب و دیگر صوبوں اور ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں کو سندھ کی زرخیز زمینیں دی گئیں۔ مقامی ہاری بے زمین رہا۔ مقامی مزدور بیروزگار رہے۔ اس طرح مقامی اور غیر مقامی آبادی کا ایک زبردست ٹکراؤ پیدا ہوا۔ سندھ کی اکثر بڑی پوسٹوں پر تھانوں کے ایس ایچ اوز وغیرہ سے لیکر موجودہ آئی جی سندھ؟؟؟ تک بھی افسران باہر سے لائے گئے۔ سندھیوں کو سرعام نااہل کہا گیا۔ سندھ کے قدرتی وسائل

پر وفاق کا قبضہ برقرار ہے۔ سندھ دو یونٹوں میں سب سے زیادہ دینے والا صوبہ ہے یعنی 75 فیصد تک اسے 20 فیصد سے بھی کم واپس دیا جاتا ہے۔

اسی طرح زبان، ثقافت، لوک ورثے و تہذیب کو برباد کیا جاتا رہا ہے۔ کسی قسم کی کوئی توجہ حکمرانوں کی طرف سے نہیں دی گئی ہے۔ اس طرح کے سوال سے جڑتے ہوئے سامراج دشمن بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اسی طرح زبان کے مسئلے پر بھی بائیں بازو نے اپنا شاندار کردار ادا کیا۔ سندھی انگلو تیگیا زبان کے دفاع کے لیے جو تحریک چلی اس کی سربراہی میں بائیں بازو پیش پیش رہا کیوں کہ بائیں بازو نے یہ سمجھا تھا کہ قومی حقوق اور خاص طور پر زبان مجموعی طور پر انسانی تاریخ کی ایک خاص دین ہے اور یہ بنیادی حق ہے کہ کسی بھی قوم کو اس کی زبان محفوظ رکھنے کی اجازت دی جائے۔ اس لیے سندھی زبان کے تحفظ کے لیے اس نے اپنا کردار ادا کیا۔ جب مغربی پاکستان میں بھی ون یونٹ بنا کر قوموں کے حقوق سے انکار کیا گیا تب بائیں بازو نے اپنی ون ونٹ تحریک میں شمولیت کی۔

ایوبی آمریت سے لیکر ضیاء الحق کی آمریت تک اور ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی ہر قومی جمہوری عوامی جدوجہد میں کمیونسٹوں نے عوامی نقطہ نظر اختیار کیا۔ کیمونسٹوں کو قوموں کے تاریخی وجود اور ان کے حقوق کے لیے لڑنا چاہیے اور قوموں کے حق خود اختیاری کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔

کامریڈ لینن اپنے اہم مقالے "قوموں کے حق خود ارادیت" میں کہتے ہیں کہ ہم کیمونسٹ غیر مشروط طور پر قوموں کے حقوق اور ان کی آزادی یعنی حق خود ارادیت کی مکمل غیر مشروط حمایت کرتے ہیں۔ اور تب ہی ہم قوموں کی اجتماعی رائے عامہ کو جیت سکتے ہیں۔ لینن کی نظر میں قومی مسئلہ محض اقتصادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ اس کو جمہوری اور سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اگر قومی مسئلہ محض روٹی کا اور تھوڑے بہت حقوق کا مسئلہ ہوتا تو کامریڈ لینن تاریخی حوالوں سے یہ بات نہ کرتے۔

کامریڈ لینن نے تو عالمی سرمایہ داری نظام کی سامراجیت اور نئے نوآبادیاتی جیسے ادوار کو دیکھتے ہوئے قوموں کی آزادی اور قومی تحریک کی بھی بات کی اور مارکس کے نعرے دنیا کے محنت کشو ایک ہو جاؤ کے ساتھ دنیا کی مظلوم اقوام ایک ہو جاؤ کا نعرہ بھی دیا تا کہ سامراج کی کمزور کڑیوں کو توڑا جا سکے۔ کامریڈ لینن اس ہی مقالے میں قوموں کا حق خود ارادیت میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ ظالم قوم کے کیمونسٹ کا فرض ہے کہ وہ مظلوم قوم کی آزادی کی حمایت کرے۔ اس کے حقوق کی جنگ لڑے اور مظلوم قوم کے کیمونسٹ کا فرض ہے کہ وہ اتحاد کی بات کرے مشترکہ جدوجہد کی بات کرے۔ اس طرح قوموں کے مظلوم حصوں، قومی حقوق کی جنگ کو ایک طاقت تقویت اور اتحاد ملے گا۔ کامریڈ اس کو جدلی انداز میں دیکھتے ہیں۔ افسوس کہ پاکستان میں بائیں بازو کو کبھی بھی آزادی کے ساتھ جدوجہد کرنے اور سیاست کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اگر اس طرح کا موقع فراہم کیا جاتا تو وہ پنجاب میں بھی

قومی آزادی کی تحریک کے لیے ضرور ہمدردیاں پیدا کرتے۔

پاکستان تاریخ کے انتہائی مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے ایک طرف عالمی سامراجی یلغار ہے اور دوسری طرف اس سامراجی نظام کی معاشی وسیاسی پالیسیاں ہیں۔ غربت، جہالت، دہشت گردی، مذہبی، انتہاپسندی نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی جمہوری، طبقاتی اور قومی سوال بھی اپنی شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس وقت خاص طور پر بلوچستان میں اپنی تاریخ کا پانچواں فوجی آپریشن ہو رہا ہے۔ بلوچوں کو دیوار سے لگا دیا گیا ہے۔ بلوچستان کی قومی تحریک کو ریاستی فوجی حکمت عملی کے تحت آزادی کی لڑائی لڑ رہی ہے اس وقت یہ صورتحال ہے کہ ریڈ زون اور کچھ سرداروں کے علاقوں کے علاوہ ہر شہر پر عملاً پاکستانی حکومت اور سیکیورٹی فورسز کی کوئی عملداری نہیں ہے اور یہ جنگ اپنی شدت کیساتھ جاری ہے۔ بلوچستان کی تحریک نے پاکستان میں قومی سوال کو شدت کیساتھ ابھار دیا ہے۔ پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست یقیناً ایک مشکل سیاست ہے کیوں کہ یہاں ریاستی ہیت اور ریاست مفادات وعوام کے مفادات کے درمیان ایک وسیع خلیج ہے۔ پاکستان ریاست ایک وفاق بھی نہیں اس حوالے سے ایک جمہوری عوامی وفاق بنانے کی جدوجہد بھی ایک مرحلہ ہو سکتا ہے جس میں قوموں کو بھی حقوق بشمول حق علیحدگی یا حق خودارادیت بھی شامل ہو۔ موجودہ پاکستان کے ڈھانچے میں اگر قوموں کو حقوق نہ دیئے گئے اور قومی حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے ایک جمہوری وفاق نہ بنایا گیا تو پاکستان ایک مرتبہ پھر 1971 جیسے کسی واقعے سے گزر سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں مجموعی طور پر ملک کے بائیں بازو اور خاص طور پر پنجاب کے بائیں بازو کا ایک اہم کردار بنتا ہے کہ وہ مظلوم قوموں کے حقوق کے لیے مربوط انداز میں آواز اٹھائیں اور قوموں کو یہ یقین دلائیں کہ موجودہ پاکستان و پنجاب میں آپ کے قومی حقوق کی لڑائی لڑنے والی قوتیں موجود ہیں۔ اگر اس طرح کی کوششیں بھی نہ ہوئیں تو بلوچستان کی قومی تحریک کی طرح سندھ میں بھی قوی امکانات ہے کہ اس طرز کی کوئی تحریک شروع ہو جائے۔

موجودہ حالات میں جب پیپلز پارٹی کو اقتدار دیا گیا ہے آصف علی زرداری جو بینظیر بھٹو کی سیاسی جدوجہد سے مائنس ہو گئے تھے وہ اب پلس ہیں اور باقی مائنس! اور جب پیپلز پارٹی اقتدار سے باہر ہو جائے گی تب محترمہ کی شہادت سندھ کے قومی حقوق کا استحصال ایک شدید قسم کے رد عمل کو جنم دے سکتا ہے۔ یقیناً حکمران اس کا حل نکالنے کی کوشش کریں گے مگر جس قسم کی صورتحال اس وقت ملکی حالات و مظلوم قوموں کی ہے اس میں اب شاید کسی قسم کا جبر یا ڈنڈا پاک قسم کی پالیسی کارگر نہیں رہے گی۔ پاکستان کے قوموں کے حقوق کی لڑائی اگر بائیں بازو نے نہ لڑی یہ اپنے فریضے پورے نہ کیے اور تاریخ میں عالمی سامراج اور اس کی پٹھو نام نہاد سیاسی قوتوں کو موقع فراہم کیا گیا تو اس کے نتائج 1947ء کی طرح کسی طرح اس خطے کی مظلوم اقوام و طبقات کے حق میں نہیں نکلیں گے۔ عالمی سامراجی قوتیں اور امریکہ یقیناً اس خطے میں اپنے مفادات اور ان کے تحفظ کی سیاست چاہتے ہیں اور

ان سیاسی قوتوں کو بھی منظم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی صورت بھی معروضی حالات وحقائق سے بے خبر نہیں ہیں اس لیے وہ بھی سندھ و بلوچستان کی قوم پرست قوتوں سے رابطے میں ہیں۔ ان کے حوالے سے کئی خبریں بھی گردش کر رہی ہیں۔ سندھ میں بائیں بازو کے اخبار عوامی آواز نے رپورٹ کیا ہے کہ امریکہ اپنے 8 دفاتر سندھ کے مختلف شہروں میں کھول رہا ہے اور قوم پرستوں سے بھی رابطے میں ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جو یہاں کی حقیقی عوامی جمہوری و قومی جدوجہد کے لئے خطرے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس ساری صورتحال کا درست تجزیہ و ادراک کرنا اور اپنا عملی کردار ادا کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اگر تاریخ کے اس اہم مرحلے پر ہم نے اس موقعے کو کھو دیا اور ایک مرتبہ پھر عالمی سامراجی قوتیں اور مقامی گماشتے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں تو یہ خطہ ایک مرتبہ پھر لمبی غلامی میں چلا جائے گا۔ عوامی، جمہوری، قومی وطبقاتی محاذوں پر بائیں بازو کی درست حکمت عملی حالات کو ایک نیا رخ دے سکتی ہے۔ مظلوم قوموں کا مستقبل اس خطے کی سامراج مخالف سوشلسٹ تحریک کیساتھ جڑا ہوا ہے اور سوشلسٹ تحریک ہی قوموں کی حقیقی آزادی کی امید ہے۔

☆☆☆

محنت کش طبقہ کے مسائل اور ٹریڈ یونین تحریک

پاکستان میں 8 سالہ مشرف آمریت کے خاتمے اور ملک میں سویلین حکومت کے قیام کے ساتھ ملک میں جاری معاشی، سیاسی و معاشرتی بحران نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ ملک میں بننے والی صوبائی اور وفاقی حکومت پاکستانی عوام اور خصوصاً مزدور طبقہ کو وابستہ امیدیں تیزی سے اپنے منطقی انجام یعنی نا امیدی میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ مارشل لاء دور کی جاری تمام پالیسیاں جوں کی توں جاری ہیں اور ان کی عوام دشمن اور مزدور دشمن روش میں شدت آ رہی ہے۔ موجودہ حکومت نے اپنے سارے دور حکومت میں کسی لمحے بھی یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی کہ وہ اپنے عمل میں بھی محنت کش دشمن رویے رکھتے ہوئے ہے۔

موجودہ حکومت جب اپوزیشن میں تھی تو مزدور طبقہ اور ٹریڈ یونین کے بارے میں بلند و بانگ دعوے کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی اور مشرف حکومت کی مالیاتی اور مزدور کش پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کرنے میں محنت کشوں کے نمائندوں اور ٹریڈ یونینز کے صفوں میں کھڑی نظر آتی تھی۔ مگر عوامی جدوجہد کے نتیجے میں مارشل لاء کے خاتمے کے بعد حکومت کی تشکیل کرنے کے ساتھ ہی اس حکومت نے غیر ملکی مالیاتی اداروں کی دی گئی پالیسیوں پر تیزی سے عمل کرنے کا آغاز کیا۔ ٹریڈ یونین تحریک کے دیرینہ مطالبہ کو رد کرتے ہوئے صنعتی و مالیاتی اداروں کی دی گئی پالیسیوں پر تیزی سے عمل کرنے کا آغاز کیا۔ ٹریڈ یونین تحریک کے دیرینہ مطالبہ کو رد کرتے ہوئے صنعتی و مالیاتی اداروں کی نجکاری کے عمل کو جاری رکھا اور پہلے حملے میں سندھ میں موجود تادور پور گیس فیلڈ کی

بیگاری کرنے کی کوشش کی جسے محنت کشوں کی مشترکہ مزاحمت نے ناکام بنا دیا۔ حکومت نے محنت کشوں اور ان کی تنظیموں کے زبردست دباؤ کے نتیجے میں بدنام زمانہ آئی آر او 2002 کے خاتمے کا اعلان تو کر دیا مگر ٹریڈ یونین تحریک کے حقیقی نمائندوں کی مشاورت کے بغیر نیا آئی آر اے 2008 پارلیمنٹ سے منظور کرالیا۔ جس پر پاکستانی محنت کشوں اور مزدور تنظیموں کے شدید تحفظات موجود ہیں۔ کیونکہ اس میں الفاظ کے ہیر پھیر سے سرمایہ داروں کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک ایسا قانون مزدوروں پر تھوپ دیا گیا ہے جس میں ان کی مشاورت قطعی شامل نہیں ہے۔

صورتحال یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے اعلان کردہ تنخواہ بھی صرف اعلان ہی بن کر رہ گیا ہے۔ ملک کے 90 فیصد سے زائد محنت کش 6000 ماہوار تنخواہ کے حق سے محروم ہیں اور حکومت اس پر عملدرآمد کے لئے سنجیدہ قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ وزیر اعظم کے اپریل 2008 کے اعلان کے مطابق موجودہ حکومت نے مجوزہ قومی لیبر پالیسی دستاویز پر تجاویز مانگنے کے سلسلے کا آغاز کیا ہے مگر اس میں بھی حکومتی رویہ غیر سنجیدہ اور تساہل پر مبنی ہے۔ مجوزہ لیبر پالیسی دستاویز نہایت عجلت میں تیار کیا گیا ایسا مسودہ ہے جو موجودہ حالات میں محنت کش طبقے کو درپیش مسائل اور ان کے حل کا احاطہ نہیں کرتا۔ اس میں سرمایہ دارانہ گلوبلائزیشن WTO اور آئی ایم ایف کی پالیسیوں کے نتیجے میں تشکیل پانے والی حکمت عملیوں کو دستاویز کا حصہ بنانے سے اجتناب برتا گیا ہے۔ ملک میں ٹریڈ یونین تحریک پر بڑھتی ہوئی پابندیوں کے خاتمے، بیگاری کے جاری عمل، محنت کش عوام کے لئے سہولتوں کے خاتمے اور ان کے سماجی تحفظ کے لئے حکومت کی ترجیحات کا اس دستاویز کا حصہ نہیں بنایا گیا ہے اور نہ ہی ملک میں پھیلتے ہوئے غیر رسمی صنعتی شعبے کے بارے میں خصوصاً ہوم بیسڈ محنت کش عورتوں کے بارے میں کوئی واضح حکمت عملی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دستاویز موجودہ حکومت کی مزدور طبقہ اور ٹریڈ یونین کے بارے میں غیر سنجیدہ رویے کی غمازی کرتی نظر آتی ہے۔ حکومت نے Employment & Services Condition Act 2009 بھی مزدور تنظیموں کو علم میں لائے اور مشاورت کے بغیر تیار کر کے تجاویز کے لئے پیش کر دیا ہے۔

یہ ساری صورتحال مزدور تحریک کو نئے چیلنجز کا سامنا کرنے کی جانب لے جا رہی ہے۔ ایسے وقت میں جب پورے ملک میں سیاسی حکومتیں قائم ہیں مزدور طبقہ کے حالات کار میں بہتری کے امکانات معدوم ہو رہے ہیں اور ان کے مسائل گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ صنعتی، مالیاتی و دیگر سیکٹرز میں کام کرنے والے محنت کشوں کی قلیل تعداد ہی ٹریڈ یونین میں منظم ہے جبکہ 95 فیصد سے زائد محنت کش تنظیم سازی کے حق سے محروم ہیں یہ وہ تعداد ہے جو قانوناً "ورکر" ہے اور یونین سازی کا آئینی حق رکھتی ہے۔ وہ ادارے جن میں پچھلی مارشلاء حکومت نے پابندی عائد کی تھی ان میں سے کئی ایک اداروں میں یونین بحال کر دی

گئی ہے مگر کئی ایک ادارے جن میں موجودہ حکومت کی حامی سیاسی یونینز موجود نہیں وہاں ٹریڈ یونین پر اسی طرح پابندی عائد ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال کراچی شپ یارڈ انجینئرنگ ورکس ہے جہاں ابھی تک ٹریڈ یونین پر پابندی عائد ہے۔ حکومت ٹریڈ یونین سرگرمیاں بحال کرنے میں سنجیدہ نظر نہیں آرہی۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں موجود لیبر قوانین پر صنعتی اداروں میں عملدرآمد کو صنعت کا انتظامیہ اہمیت کی حامل تصور نہیں کرتی۔ اسی لئے ہمیں حکومتی احکامات اور قوانین کی بدترین خلاف ورزی صنعتی اداروں میں نظر آتی ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ 92 فیصد سے زائد صنعتی و دیگر اداروں میں کام کرنے والے محنت کشوں کے پاس اپنے اپنی ملازمت میں ہونے کا ثبوت موجود نہیں۔ WEBCOB اپنا کردار ادا کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ ورکرز کے سماجی تحفظ کے اداروں خصوصاً سوشل سیکیورٹی، ورکرز ویلفیئر بورڈ، ای او بی آئی جیسے اداروں کے دائرے میں آنے والے ورکرز کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے کیونکہ سرمایہ دار اور انتظامیہ اور ان کے اداروں کے بعض اہلکاروں کی ملی بھگت کے نتیجے میں مالکان خود کو قانونی ذمہ داریوں سے غیر قانونی طور پر مستثنیٰ کروا لیتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے سرمایہ دارانہ بحران کے اثرات براہ راست مزدوروں پر پڑ رہے ہیں اور انہیں بلاجواز نوکریوں سے برخاست کیا جا رہا ہے اس کا پہلا نشانہ ٹریڈ یونین میں متحرک باشعور مزدور بنے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں برطرف ہوئے مزدور بلاواسطہ طور پر ملک میں موجود کمزور کرنے میں کلیدی عنصر بن رہے ہیں جبکہ مزدوروں کے لئے قائم لیبر کورٹس، لیبر ڈیپارٹمنٹس اس صورتحال کا تدارک کرنے سے دانستہ طور پر پہلوتہی کرتے نظر آتے ہیں اور لیبر کورٹس میں مقدمات مزدوروں کو عمومی طور پر مایوسی کے سوا کچھ نہیں دیتے۔

صنعتی اداروں میں نئی ٹریڈ یونین کا قیام اس قدر پیچیدہ کر دیا گیا ہے کہ یہ ناممکنات میں سے نظر آتا ہے۔ یونینز کے قیام کے عمل میں سرمایہ دار طبقہ کے ساتھ ساتھ حکومتی اداروں میں دھڑے مشکلات پیدا کرتے نظر آتے ہیں۔ سرمایہ داروں سے لیبر ڈیپارٹمنٹس کا گٹھ جوڑ ٹریڈ یونین تحریک کو دوہرے جبر کا نشانہ بنا رہا ہے۔ یہی صورتحال "این آئی آر سی" میں مزدوروں کو درپیش ہے۔ محنت کشوں کی جدوجہد کے نتیجے میں ان کے حقوق کے تحفظ کے لئے بنائے گئے ادارے خود ان کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان اداروں میں ہونے والی تقرریوں میں سیاسی و مارشلائی حکومتوں کی بڑھتی ہوئی ناقابل برداشت اقرباپروری نے ان کی شکل بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ فیصلوں میں سیاسی مصلحتوں کو پیش نظر رکھنے کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے جو کہ حقیقی ٹریڈ یونین کی مضبوطی میں بڑی رکاوٹ بن رہا ہے جبکہ ان اداروں میں مزدوروں کی حقیقی نمائندگی ناپید ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے یہ ادارے اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں۔

یہ صورتحال تو ایسے شعبوں سے متعلق ہے جو کہ منظم کہلاتا ہے۔ اور انہیں قانوناً بہت سے حقوق کے حصول کا اہل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن کروڑوں کی تعداد میں وہ محنت کش بھی ہیں جنہیں قانوناً مزدوری تسلیم نہیں کیا

جاتا۔ یہ غیر رسمی شعبے کے غیر منظم مزدور ہیں جن کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور ملکی قوانین انہیں کسی بھی قسم کا قانونی، سماجی اور معاشی تحفظ فراہم کرنے سے قاصر ہیں اور ان میں خواتین کی تعداد ساٹھ فیصد سے بھی زائد ہے۔ سامراجی گلوبلائزیشن کے نتیجے میں قومی منڈیوں کو کھولنے سے سماج کو منڈی کی اندھی بیرونی قوتوں کے رحم وکرم پر چھوڑنے کے نتیجے کے طور پر غیر رسمی شعبہ میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ ہمیں کان کنی، چوڑی سازی، چمڑے، تعمیرات، شپ بریکنگ، ہوٹل، آٹو میکینک، ٹیکسٹائل، گارمنٹس اور دیگر دستکاری ابھرتے ہوئے شعبوں میں نظر آئے گا جہاں محنت کشوں کے حالات کار ابتدائی سرمایہ داری میں محنت کشوں کی بدحال صورت کا نقشہ پیش کرتے نظر آئیں گے۔ جہاں کوئی اوقات کار طے نہیں، اجرتیں نہایت قلیل، ملازمت کا عدم تحفظ، سماجی تحفظ ناپید اور مالکان سے تنازعہ کی صورت میں چارہ جوئی کے لئے کوئی قانونی طریقہ کار موجود نہیں۔ یہی صورتحال غیر رسمی شعبے میں گھر مزدور خواتین کو درپیش ہے اور وہ بدترین استحصال کا شکار ہیں۔ جبکہ حکومت آئی ایل او کنونشن برائے ہوم بیسڈ ورک C-177 کی توثیق کرنے سے انکاری ہے جو ان کروڑوں محنت کش عورتوں کو حقوق فراہم کرتا ہے

اس ساری صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ محنت کش چاہے وہ کسی (منظم) شعبہ سے تعلق رکھتا ہو یا غیر منظم شعبے سے وہ زندگی کی تمام سہولیات سے محروم ہے اور جہاں اسے حقوق حاصل ہیں اس پر عملدرآمد ناممکن جہاں وہ تمام حقوق اور مراعات سے محروم ہیں وہاں حکمران مزدور دوست اقدامات کرنے پر تیار نہیں ایسی صورتحال میں پاکستان کی مزدور تحریک اور ٹریڈ یونین کو سخت چیلنجز درپیش ہیں۔ اسے حاصل کردہ ٹریڈ یونین حقوق اور مزدوروں کی مراعات کا تحفظ کرنا ہے اور حکومتی پالیسیاں جو مزدوروں کے حقوق پر حملے پہنچی ہیں ان کی مزاحمت کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس کا ادراک شائد ٹریڈ یونین تحریک میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ مزدور و تنظیمیں صورتحال کی گھمبیرتا کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا پھر دفتری طور پر اس کا سامنا کرنے سے کترا رہی ہیں۔ آج کی صورتحال میں مزدوروں کے حقوق کی جدوجہد میں منظم مزاحمت کا راستہ ہی واحد طریقہ ہے جس سے مزدور اور ٹریڈ یونین تحریک میں زندگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ٹریڈ یونین فیڈریشنیں تنظیمی طور پر نہایت کمزور ہیں جبکہ ان کے درمیان مشترکہ مسائل پر مل کر مقابلہ کرنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے اور عمومی طور پر وہ صنعتی اداروں اور دفتروں میں اپنا اثر و رسوخ کھوتی جا رہی ہیں جس کے نتیجے میں سرمایہ داروں کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ حکمرانوں کی مزدور دشمن معاشی و سیاسی پالیسیوں کو مشترکہ طور پر چیلنج کیا جائے۔ حکمرانوں کی سرمایہ دوست قانون سازی کو روکنے کے لئے مزاحمتی روایات کو فروغ دیا جائے اور نئی یونینز کی تشکیل اور غیر رسمی شعبہ کے محنت کشوں خصوصاً خواتین کو منظم کیا جائے اور ٹریڈ یونین تحریک کو بین الاقوامی مزدور تحریک کا حصہ بنایا جائے تا کہ نیو لبرل معاشی ایجنڈے کی تکمیل کو ناکام بنایا جا سکے۔

----☆----

لیبر پارٹی پاکستان کا سرائیکی قومی سوال پر تفصیلی نقطہ نظر

وسائل و اختیارات، اور آبادی کے اعتبار سے پنجاب کی بالادستی کے نتیجہ میں چھوٹے صوبوں اور قوموں میں بے چینی اور وفاق پر عدم اطمینان میں اضافہ جاری ہے۔ اور صوبوں کے مابین مالی اختیارات سے لے کر قدرتی وسائل کی تقسیم جیسے سنگین حل طلب مسائل موجود ہیں۔ حکمرانوں جن کی اکثریت کا تعلق پنجاب کے بالادست طبقات سے رہا ہے۔ دوسری قوموں کا استحصال بھی کر رہے ہیں۔ سرائیکی جو کہ اپنی شناخت اور بود و باش، تہذیب و تاریخ اور جغرافیائی حیثیت کے اعتبار سے ایک علیحدہ قوم ہے۔ حکمران سرائیکی خطہ کے بالادست طبقات، جاگیرداروں، وڈیروں کے ساتھ مل کر غریب عوام کے استحصال کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سرائیکی علاقے کی بے آباد زمینوں کو آباد کرنے کے نام پر بے زمین مقامی مزارعوں کی بجائے دوسرے لوگوں کو الاٹ کی جاری ہے۔ جب کہ سرائیکی خطہ جو کہ دنیا کی بہترین کپاس پیدا کرتا ہے۔ بنیادی ضروریات زندگی، پانی، نکاسی آب، تعلیم، صحت، روزگار کی سہولیات کے لیے گزشتہ 60 برسوں سے حکمرانوں کی نظر کرم کا منتظر ہے۔ سرائیکی خطے کی کل آبادی پچھلی مردم شماری کے مطابق ساڑھے چار کروڑ ہے۔ اس زمین میں پہاڑی، بارانی دریائی، ریت، کچا، نہری یہ بھی قسم شامل ہیں۔ قابل کاشت زمین ساڑھے تین کروڑ ایکڑ ہے۔ بڑی فصلوں میں گندم دالیں، تمباکو، تیل کے بیج، کپاس، مکئی، جوار اور باجرہ ہیں۔ زیادہ تر سرائیکی علاقہ جاگیرداروں اور قبائلی سسٹم کی جابرانہ گرفت میں ہے۔ جنہوں نے شعوری طور پر تعلیم، سڑکوں، نہری سہولیات کو فراہم کرنے میں کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ کل زرعی رقبے کا صرف 1 کروڑ ایکڑ نہری ہے۔ جبکہ ایک کروڑ ایکڑ کو ٹیوب ویل، برساتی نالوں اور موسمی برساتی پانی جیسے وسائل آبپاشی مہیا ہیں۔ کل زرعی اراضی کا 80 فیصد صوبائی حکومت اور جاگیردار خانوں کے قبضہ میں ہے۔ سرکاری رقبہ جس میں چولستان، دھندی سٹیٹ اور دامان کے رقبہ جات ہیں۔ وہ کبھی بھی مقامی سرائیکی ہاری کو الاٹ نہیں کیے جاتے۔ سرکاری رقبہ اونے پونے داموں بیوروکریٹس یا ان کے عزیزوں کو الاٹ کر دیا جاتا ہے۔ یہ عمل خاص طور 1977ء کے ضیاءالحق کے مارشل لاء کے دوران تیز ہوا۔ فوجی و سول بیوروکریسی کو سرائیکی علاقوں میں دھڑا دھڑ زمین الاٹ کی گئیں۔ سرائیکی سوال سب سے پہلے 1955ء میں سامنے آیا جب سندھ، بلوچستان، سرحد اور ریاست بہاولپور کو پنجاب میں مدغم کر کے مغربی پاکستان کے ون یونٹ کا نام دیا گیا۔ ایوب خان کے دور میں بہت سے سرکاری افسران اور فوجی افسروں کو سرائیکی علاقہ اور سندھ میں زمینیں الاٹ کی گئیں۔ جب تک یہ زمینیں غیر آباد تھیں تو غریب سندھی اور سرائیکی ان پر محنت کرتے رہے لیکن جیسے ہی بیراجوں اور ہیڈوں کی مدد سے انہیں سیراب کیا جانے لگا تو یہ سول اور ملٹری بیوروکریسی کو عنایت کی جانے لگیں۔ پنجابی زمیندار اپنے کسان اور مزارع بھی پنجاب سے درآمد کرنے لگ گیا۔ 1970ء میں جب ون یونٹ بحال کیا گیا اور ریاست بہاولپور کو پنجاب کا

حصہ بنالیا گیا۔ سرائیکی علاقہ میں قومی تحریک مذکورہ دور میں تیز ہوئی۔ کلچرل سرگرمیوں سے لے کر صوبہ بنانے کا مطالبہ سرائیکی قومی تحریک کے (Oppressed Nation Movement Pakistan) استحصال زدہ قوموں کی تحریک نے سرائیکستان صوبے کا مطالبہ کیا۔ یہ تحریک جو عمومی طور پر ONM کے نام سے جانی جاتی ہے۔

سوشلسٹوں کا قومی استحصال کے بارے میں کیا نقطہ نظر ہے؟ سرائیکی تحریک کو ہم کس طرح دیکھتے ہیں؟ ان سوالات کا جائزہ مندرجہ بالا حقائق اور دیگر عمومی تجربات کی روشنی میں لیا جائے گا۔ سوشلسٹ قوم پرست نہیں ہوتے۔ یہ محنت کش طبقات کے اتحاد کی بات کرتے ہیں مگر یہ طبقاتی اتحاد کس طرح حاصل کیا جائے؟ یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب کسی بھی ایک خاص قوم کے محنت کش طبقات سے ہونے والی تمام تر زیادتیوں کے خلاف کھل کر آواز بلند کی جائے۔ مثال کے طور پر اگر سندھ میں رہنے والے ہاری عوام کی بجائے پنجاب اور دیگر علاقوں کے فوجی بیوروکریٹوں کو الاٹ کی جارہی ہوں۔ تو ہمیں لازماً اس زیادتی کے خلاف کھل کر آواز بلند کرنی ہوگی۔ تبھی ہم سندھ سے تعلق رکھنے والے ہاریوں کو ایک طبقاتی اتحاد میں لانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ سوشلسٹ ہر قسم کے استحصال کے خلاف ہیں چاہے وہ قومی بنیادوں پر ہو، مذہبی بنیادوں پر یا خواتین اور نوجوانوں کے خلاف ہو۔ سوشلزم ایک جمہوری فضا کا نظریہ ہے۔ جہاں ہر ایک کو اس کی مرضی منشاء کے مطابق اپنے بارے میں، اپنے سماج کے بارے میں، اپنے نظام کے بارے میں رائے دینے اور فیصلے کرنے کا حق حاصل ہو۔ جہاں اسے پیسے، دھونس، دھاندلی، سے خریدا نہ جاسکتا ہو۔ اس پیش منظر میں ہم قوموں کے حق خودارادیت کی مکمل حمایت کرتے ہیں اور ان کی علیحدگی کے جمہوری حق کی بھی حمایت کرتے ہیں۔ پاکستان جیسے کثیر القومی ریاست میں لیبر پارٹی پاکستان میں بسنے والی تمام قوموں اور گروہوں کے حقوق کی علمبردار ہے۔ دوسری جانب لیبر پارٹی پاکستان پورے پاکستان کے محنت کشوں کے طبقاتی اتحاد پر مشتمل ایک سوشلسٹ انقلاب کے لیے جدوجہد کررہی ہے۔ انقلاب کا کوئی سیدھا راستہ نہیں۔ صرف طبقاتی جدوجہد کا راگ الاپنے سے ہم حقیقی طور پر محنت کش طبقے کا اتحاد حاصل نہیں کرسکتے۔ ہمیں ہر علاقہ میں موجود طبقاتی، قومی و دیگر بنیادوں پر استحصال کی نوعیت جانتے ہوئے شعور کی پہچان کرنی ہے اور ایک خاص معروضی صورت حال کی بنیاد پر اپنے مطالبات کی تشکیل کرنی ہے۔

پنجابی حکمران طبقات کے استحصال کی نوعیت دوہری ہے۔ ایک طرف قومی بنیادوں پر اور دوسری جانب طبقاتی بنیادوں پر ہم پنجابی حکمران طبقات کے ان تمام جودیوں کے بھی خلاف ہیں۔ جن کا تعلق چاہے کسی بھی صوبے یا قوم سے ہو۔ تمام جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے بھی جو قومی استحصال کو بنیاد بنا کر اپنا طبقاتی جبر جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ لیبر پارٹی پاکستان کی قومی مسئلہ پر عمومی رائے تو یہ ہے کہ ہم ہر قوم کے حق خودارادیت کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان علاقوں میں اقلیتوں کے حقوق کی بھی کھل کر حمایت کرنی ہوگی۔ ہم کسی بھی علاقے میں نسلی برتری اور نسل کشی کے شدید خلاف ہیں۔ ہم نسل پرست نہیں جو کسی ایک خاص

علاقہ میں کسی ایک خاص قوم کی برتری کی بات کرتے ہیں بلکہ ہر قوم کے اندر موجود تمام نسلی و لسانی گروہوں کے حقوق کے دفاع کی بھی بات کرتے ہیں۔

لیبر پارٹی پاکستان "سرائیکیوں" کی الگ قومی شناخت تسلیم کرتی ہے اور سرائیکی وسیب پر ان کا حق مانتی ہے۔ اس نے ہمیشہ سرائیکیوں کے الگ صوبے کے مطالبے کی حمایت کی ہے اور مرکز و پنجاب سے ان کے جتنے بھی مطالبے ہیں۔ ان کو پورا کرنے کی تائید کی ہے۔ لیبر پارٹی پاکستان سرائیکی اضلاع کو ایک الگ تہذیبی، ثقافتی قومی خطہ مانتی ہے اور سرائیکی قومی سوال کو طبقاتی جدوجہد کے ساتھ جوڑ کر اس کاز کی تکمیل کے لیے یہ بہتر سمجھتی ہے کہ سرائیکی اضلاع پر مشتمل خطے کی ایک مکمل الگ صوبائی تنظیم ہونی چاہیے۔ لپ

----☆----

محنت کش طبقہ اور سماجی حالات

1980ء میں پاکستان نے اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام پر دستخط کرکے آزاد منڈی کے عالمی پرفریب نعرے میں شامل ہوکر ملک کو عالمی مالیاتی شکنجے کا جکڑ دیا۔ آزاد منڈی کے اس عالمی پرفریب نعرے نے ایک نئے نوآبادیاتی نظام کے تحت پسماندہ اور غریب ممالک کو اپنا دست نگر اس حد تک کرلیا ہے کہ دنیا بھر کے ترقی پذیر ممالک افلاس اور غربت کی دلدل میں دھنس کر اپنی ہر قسم کی خودمختاری کھو بیٹھے ہیں۔ دنیا عالم نے تاریخ میں کبھی ایسی بربریت نہیں دیکھی تھی کہ آج دنیا میں جدید ٹیکنالوجی نے کم وقت اور کم لاگت سے پیداوار کے ڈھیر لگا دیے ہیں ایک عالمی ریسرچ کے مطابق اگر دنیا کا ہر فرد صرف 2 گھنٹے کام کرے تو دنیا بھر کے انسانوں کی تمام ضروریات پوری ہوسکتی ہیں اور ایک خوشحال دنیا معرض وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی منافع خوری کی وجہ سے آج پسماندہ اور خوشحال ممالک کے محنت کش خوراک، روزگار، رہائش، تعلیم اور صحت کے مسائل سے جس قدر دوچار ہیں تاریخ میں کبھی ایسی مثال موجود نہیں تھی جس کی تباہ کاریاں امریکہ اور ترقی یافتہ ممالک میں حالیہ عالمی معاشی کے نتیجے میں سامنے آئیں اور پسماندہ ممالک میں معاشی حالات نے محنت کشوں کو خودکشیوں کی طرف دھکیل دیا۔

اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام اور نیولبرل ایجنڈا کے عالمی سطح پر لاگو ہونے کے بعد دنیا بھر اور پاکستان میں 2009ء میں صورتحال یہ ہے کہ 17 کروڑ پاکستانیوں میں سے 22فیصد کی روزانہ آمدن 1.25 ڈالر جبکہ 60.03 فیصد کی روزانہ آمدن 2 ڈالر سے کم ہے آج پاکستان کا پلاننگ کمیشن تسلیم کرتا ہے کہ غربت کی شرح 40فیصد جبکہ آزاد معیشت دان افلاس زدہ زندگی گزارنے والوں کی تعداد سات کروڑ بتاتے ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق کم ازکم چھ ہزار روپے کمانے والے صرف اپنی خوراک پر 4800 روپے خرچ کرتے ہیں جبکہ

پاکستان میں 85فیصد صنعتی وتجارتی اداروں میں کم از کم تنخواہ 6000ء روپے پر عمل درآمد نہیں ہوتا حالانکہ غیر منظم شعبہ میں کل لیبر فورس کا 87فیصد ہے جہاں 2500 روپے سے 4000 روپے تنخواہ دی جاتی ہے جبکہ کل لیبر فورس کا 5فیصد منظم شعبہ سے منسلک ہے۔ نومبر 2009ء میں شائع ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت ملک کی کل آبادی میں 30فیصد آبادی دس سال سے کم عمر والوں کی ہے جبکہ 25فیصد آبادی دس سال سے بیس سال کی عمر والوں کی صرف 40فیصد آبادی بیس سے ساٹھ سال عمر اور 5فیصد افراد ساٹھ سال سے زائد عمر کے ہیں جبکہ 47فیصد نوجوانوں کا تعلق غربت سے نیچے رہنے والے خاندانوں سے ہے۔

پاکستان میں کل آبادی کا 67.5فیصد دیہاتوں میں رہائش پذیر ہے اور شہری آبادی کا تناسب 23.5 فیصد ہے کل شہری آبادی میں سے صرف 19.4فیصد شہریوں کو پینے کا صاف پانی میسر ہے۔ 77فیصد دیہی آبادی کو صاف پینے کے پانی کی سہولت میسر نہیں، 45فیصد آبادی نکاسی آب کے سہولت سے محروم ہے جس کی وجہ سے گندے پانی کے جوہڑ اور کھلے نالوں کی وجہ سے بیماریوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تعلیم: 1951ء کی مردم شماری کے مطابق شرح خواندگی حکومتی اعتبار سے 16.4فیصد تھی جبکہ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق 43.9ء فیصد موجودہ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق شرح خواندگی 53فیصد اس کے برعکس آزاد ذرائع شرح خواندگی کا اندازہ 33فیصد بتاتے ہیں۔ 2005ء کے سرکاری سروے کے مطابق سرکاری سکولوں کی تعداد 1,64,579 تھی جبکہ گھوسٹ سکولوں کی تعداد 12737تھی۔ جنوری 2009ء یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق سرکاری سکولوں میں جانے والے بچوں کی تعداد دو کروڑ دس لاکھ جبکہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں جانے والے بچوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ اس سکول جانے کی عمر میں سکول جانے سے محروم رہنے والوں کی تعداد ایک کروڑ تیرہ لاکھ تھی جس میں لڑکیوں کی تعداد 70فیصد تھی۔

نومبر 2009ء کی ایک ریسرچ کے مطابق 83فیصد سکول جانے والے بچوں میں سے 50فیصد بچے پانچویں جماعت سے قبل ہی تعلیم چھوڑ کر چائلڈ لیبر میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ملک بھر کے 16662مذہبی مدرسوں میں سے 4509مدرسوں تک حکومت کی رسائی نہیں اور باقی کے 12153مدرسوں میں غربت سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور اپنے بچوں کو پڑھنے کیلئے بھیجتے ہیں۔ جن کی تعداد بشمول طلباء وطالبات 15 لاکھ 49ہزار سے زائد ہے۔ جہاں پر یہ نوجوان طلبا وطالبات مذہبی رجحان میں گرفتار ہو کر انتہاء پسندی کی تقویت کا باعث ہیں۔ ریاست کل بجٹ کا تعلیم پر صرف 2.4فیصد خرچ کرتی ہے جبکہ ہمارا مطالبہ ہے کہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں اور مدرسوں کے نظام کی جگہ پہلی سے یونیورسٹی تک تعلیم ہر شہری کیلئے مفت ریاست مہیا کرے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب کل بجٹ کا تعلیم پر دس فیصد خرچ کیا جائے۔

صحت: پاکستان میں 965سرکاری ہسپتال ہیں جس کے مقابلہ میں پرائیویٹ ہسپتالوں کی منڈی لگی ہوئی ہے

جہاں 90فیصد پاکستانی جانے سے خوف محسوس کرتے ہیں کہ علاج ان کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے اور اقص بھی لاہور کے ڈاکٹرز ہسپتال کی ایک مثال سامنے ہے جہاں یک بچی کو ہاتھ جلنے کے بعد لایا گیا وہاں ڈاکٹروں نے پیسے بٹورنے کے لئے غلط انجکشن لگا کر بچی کو موت کے حوالے کر دیا۔ صحت کی سہولتوں کی فقدان کی وجہ سے ہر سال 30ہزار خواتین صحت کی سہولتوں کی عدم دستیابی اور ناقص سہولتوں کی وجہ سے زندگی کی بازی ہار جاتی ہیں۔

☆ہر سال چار لاکھ بچے صحت کی سہولتوں کی کمی کی وجہ سے وفات پا جاتے ہیں۔
☆ہر تیسرا شخص بلڈ پریشر کا مریض ہے۔
☆ہر چوتھا شخص شوگر کا مریض
☆ہر تیسری عورت کینسر کی مریض
☆ہر ساتواں شخص ہیپاٹائٹس کا مریض ہے۔

اور یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کی بوسیدگی کی وجہ سے ہے۔ ان بیماریوں کو ختم کرنا ممکن ہے اگر معاشرے کو ایک منصفانہ سوشلسٹ معاشرے میں تبدیل کر دیا جائے۔

زراعت: 11 اکتوبر 2009ء کی ایک ریسرچ کے مطابق پاکستان کپاس پیدا کرنے والا دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے گندم اور چاول پیدا کرنے والا ایشیا کا تیسرا بڑا ملک ہے گنا اور دودھ پیدا کرنے والا دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے اس کے باوجود سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے کبھی آٹے کبھی چینی اور کبھی دھاگے کبھی سیمنٹ کا بحران جنم لے لیتا ہے۔

زراعت معیشت کا سب سے بڑا شعبہ ہے 44فیصد کا روزگار اسی شعبہ سے وابستہ ہے جبکہ دیہاتی آبادی کا 67فیصد اسی شعبہ سے روزگار منسلک ہے۔ پاکستان کے زیر کاشت رقبہ کیلئے بہترین نہری نظام موجود ہے جبکہ ڈیڑھ لاکھ ٹیوب ویل بجلی سے اور ساڑھے 18 لاکھ ڈیزل سے چلتے ہیں اور زمین سیراب کرتے ہیں۔ پاکستان سولر انرجی کے لئے ایک بہترین خطہ ہے لیکن حکمرانوں کی لوٹ اور سامراجی گماشتگی کی وجہ سے تاحال سولر انرجی سے استفادہ نہ کیا گیا۔ پاکستان میں شہروں کے مقابلے میں دیہاتوں میں خط افلاس سے نیچے رہنے والوں کی تعداد زیادہ ہے جہاں کل قابل کاشت زرعی زمین ایک اندازے کے مطابق 5 کروڑ 59 لاکھ 20ہزار ایکڑ ہے۔ پاکستان کے دیہاتوں میں رہنے والی دیہی آبادی کے 80 لاکھ خاندانوں کے پاس زرعی زمین کا کوئی ٹکڑا نہیں۔ کل زرعی زمین کا 37 فیصد 95 فیصد چھوٹے کاشت کاروں کے پاس ہے جبکہ 67فیصد زرعی زمین پر چند جاگیردار خاندانوں، سیاستدانوں، ریٹائرڈ جرنیلوں اور سول افسر شاہی کے قبضہ میں ہیں۔

پاکستان میں تین بار زرعی اصلاحات ہوئیں اس کے باوجود آج بھی زرعی زمین کی ملکیت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی ضروری ہے کہ ایک مؤثر زرعی اصلاحات کر کے فی خاندان ساڑھے بارہ ایکڑ زمین تقسیم کر

کے پاکستان کی دیہاتی آبادی میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں جہاں ایک خوشحال حال زندگی کا تصور ہر زرعی شعبہ کے حالات بتاتے ہیں کہ مقامی حکمرانوں کا عالمی سامراجی گماشتگی میں کردار ہی موجودہ حالات کی وجہ ہے۔

پاکستان اپنے قیام کے بعد سامراجی تسلط کی آماجگاہ بنا دیا گیا اور خصوصی طور پر 1958ء کے بعد ترجیحات عوام کی فلاح نہ رہیں بلکہ دفاع اور عالمی قرضوں کی واپسی ترجیحات بن کر سامنے آئیں پاکستان 70فیصد بجٹ کا صرف دفاع اور قرضوں کی واپسی، ان دو مدوں میں خرچ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ نومبر 2009ء ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی ماہر معیشت کے مطابق کرپشن لوٹ کھسوٹ حکومت اور حکومتی اداروں کے شاہانہ اخراجات ریاستی اداروں کی ناقص کارکردگی، ٹیکس چوری کی وجہ سے قومی خزانے نے ہر سال ایک ہزار ارب کا نقصان ہوتا ہے۔

☆☆☆

لیبر پارٹی تاریخ اور جدوجہد

لیبر پارٹی پاکستان اپنی پانچویں کانگریس 27-26 جنوری 2010ء میں فیصل آباد میں کرنے جا رہی ہے۔ یوں لیبر پارٹی اپنے قیام کے 13ویں سال میں داخل ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ لیبر پارٹی پاکستان کس مسیحا کی سوچ اور خواب کا اظہار ہے یا ایک مسلسل جدوجہد کا نتیجہ! لیبر پارٹی پاکستان کی جدوجہد کی لمبی تاریخ ہے اور لیبر پارٹی کی تعمیر کے لئے بنیادیں ٹھیک آج سے تیس سال پہلے 1980ء میں رکھی گئیں۔ ضیاء آمریت میں پیپلز پارٹی کے ساتھ بائیں بازو کے دانشور اور سیاسی کارکن بھی زیر عتاب آئے اور جلاوطن ہونے پر مجبور ہوئے ان جلاوطنوں میں نوجوان بھی شامل تھے جنہوں نے یورپ کے مختلف ملکوں میں پیپلز پارٹی کے 14 یونٹوں کو منظم کرنے میں کردار ادا کیا اور پیپلز پارٹی کے طبقاتی کردار پر بحث و مباحثہ شروع کیے نوجوانوں کا یہ گروپ اس نتیجے پر پہنچا کہ پیپلز پارٹی کا قیام ایک خاص حالات میں ہوا اور محنت کش طبقے نے جوش و خروش کیساتھ اس میں شمولیت کی جس کا ثمر محنت کش طبقے کو نہ مل سکا اور پیپلز پارٹی پر جاگیرداروں اور استحصالی طبقوں کا غلبہ ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود محنت کش طبقے کی اُمیدیں پیپلز پارٹی سے وابستہ تھیں۔

گروپ پیپلز پارٹی کے کردار سے واضح ہوا تو سوال یہ سامنے آیا کہ پھر کیا کیا جائے؟ گروپ کا اس وقت پر اتفاق تھا کہ پیپلز پارٹی ایک بورژوا پارٹی ہے آج ہمیں ضیاء آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے ایک انقلابی متبادل کی بنیاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ پیپلز پارٹی اقتدار میں آ کر ہی بے نقاب ہو سکتی ہے لہٰذا آنے والے حالات کے پیش نظر ایک تنظیم بنائی جائے۔ تنظیم بنانے کے لیے ایک رسالہ نکالا جائے جس کے نظریات کے اردگرد محنت کشوں کو منظم کیا جائے۔ گروپ نے نومبر 1980ء میں ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم سے ماہنامہ ''مزدور جدوجہد'' کا پہلا شمارہ شائع کیا جس میں سوشلسٹ نظریات اور نظریہ مسلسل انقلاب کا پرچار شروع کیا گیا بعد از اں تنظیم سے شائع ہونے والے شمارہ ''حقیقت'' کو 1981ء میں ''مزدور جدوجہد'' میں ضم کر دیا اور جدوجہد گروپ یورپ میں پناہ کے لیے آنے والے آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے والے لیڈر کین وطن کا ساتھی و مددگار بن گیا۔ جدوجہد گروپ کی تشکیل کے بعد گروپ ہر دو سال بعد اپنی کانگریس کے ذریعے قیادت کا انتخاب کرنے لگا گروپ کے انگلینڈ اور ہالینڈ میں دفاتر اور فل ٹائمر زیر زمین نیٹ ورک تارکین وطن کے چندے سے چلتا رہا۔

مزدور جدوجہد اور گروپ کی تنظیم سازی

1986ء میں جونیجو جمہوری حکومت کے دوران جدوجہد گروپ کے رہنما پاکستان واپس آ گئے۔ جنہوں نے اس کو پاکستان میں منظم کرنے کے لئے ''مزدور جدوجہد'' رسالے کو کتابی شکل میں شائع کرنے کے بعد تنظیم سازی شروع کی۔ گروپ کی تنظیم کاری میں ماہنامہ ''مزدور جدوجہد'' نے کلیدی کردار ادا کیا۔ نومبر 1980ء

میں ہالینڈ سے جاری ہونے والا رسالہ جون 1989ء میں باقاعدہ ایڈیشن لے کر شائع ہونے لگا اور 3-4 مئی 1997ء کی کانگریس کے بعد "مزدور جدوجہد" ہفت روزہ کے طور پر شائع ہونے لگا۔ مزدور جدوجہد بائیں بازو کا واحد رسالہ ہے جو 1980ء سے 1997ء تک باقاعدہ ماہنامہ کے طور پر اور 1997ء سے 2010ء تک ہفت روزہ کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ نے انقلابی نظریات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور جس کے نتیجے میں سندھ، سرحد، سرائیکی وسیب اور بلوچستان میں پارٹی کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

1988ء سے 1990ء تک جدوجہد گروپ کا پبلک اظہار

گروپ نے 1989ء میں انقلاب روس کی 72ویں سالگرہ کا اہتمام لاہور کے وائی ڈبلیو ایڈیٹوریم میں منظم کیا۔ اسی دوران ایمپلائز نیشنلائزیشن ایکشن کمیٹی کی تشکیل کرتے ہوئے لاہور کے مال روڈ بینک سکوائر میں پہلا نجکاری مخالف مظاہرہ کیا گیا۔ جس میں گروپ کی کال پر سینکڑوں ٹریڈ یونین رہنماؤں اور کارکنوں نے شرکت کی اور گروپ ایک انقلابی شناخت کیساتھ پاکستان میں بائیں بازو اور ٹریڈ یونین کے حلقوں میں جانا پہچانا جانے لگا۔ 1990ء کے آتے آتے پیپلز پارٹی جو کہ 1988ء میں اقتدار میں آئی تھی ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی پالیسیوں پر چلتے ہوئے بے نقاب ہو کر برطرف ہو گئی اور دوسری طرف روس میں بیوروکریٹک سوشلزم کے خاتمہ کے بعد سرمایہ داری نظام بحال ہو گیا۔ پیپلز پارٹی کی سامراج دوستی میں اقتدار لینے اور بے نقاب ہونے کا تجزیہ گروپ 1980ء میں ہی کر چکا تھا تاہم 1990ء میں بھی بینظیر اور پیپلز پارٹی میں محنت کشوں کی تنقیدی حمایت موجود تھی جبکہ جدوجہد گروپ کا اکثریتی حصہ اس بات پر مصر تھا کہ پیپلز پارٹی مستقبل میں کوئی ریڈیکل ٹرن نہیں لے گی بلکہ یہ اور پرو اسٹیبلشمنٹ ہوتی چلی جائے گی اور مسلم لیگ کی طرح اس وقت تک سامراجی گماشتگی میں کردار ادا کرتی رہے گی۔ جب تک کوئی انقلابی متبادل اسے سیاست سے باہر نہیں کر دیتا۔ 1990ء میں گروپ میں یہ بحث چلی کہ پیپلز پارٹی سے الگ ہمیں اپنی شناخت کے ساتھ متبادل تعمیر کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس دوران گروپ میں ایک دھڑا پیپلز پارٹی میں رہ کر جدوجہد کرنے کے حق میں تھا جو گروپ سے الگ ہو گیا تو "جدوجہد" نے 18-19 اکتوبر 1992ء میں لاہور میں کانگریس کر کے آزادانہ بنیادوں پر سیاسی کام اور تنظیم کاری کرنے کا لائحہ عمل بنایا۔ یہ وہ دور تھا جب گروپ کے پاس کوئی دفتر نہیں تھا گروپ کا ایک فل ٹائمر تھا باقی ساتھی اپنے دفتروں اور فیکٹریوں میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ انتھک محنت اور جدوجہد کرتے ہوئے مالی قربانیاں بھی دینے لگے اور لاہور کے بیڈن روڈ پر ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے کر دفتر قائم کر لیا گیا۔

ینگ فائٹر ایک تجربہ

تجرباتی طور پر گروپ نے نوجوانوں کی تنظیم ینگ فائٹر کی تعمیر کی جس کے ایک جلسے میں کالم نگار حسن نثار نے نوجوانوں پر ایک مقالہ پڑھا اور دوسرے دن اس کو روزنامہ جنگ میں شائع کر دیا جس سے ینگ فائٹر کو

سندھ اور پنجاب میں کافی شناخت ملی اور ینگ فائٹر نے لاہور سے اسلام آباد تک ایک سائیکل مارچ منظم کیا جس کا نعرہ تھا "روزگار دو یا بیروزگاری الاؤنس دو" سائیکل مارچ کے نوجوان شرکا کو پیپلز پارٹی کے سینئر وائس چیئرمین مرحوم شیخ محمد رشید نے لاہور کے مال روڈ سے اسلام آباد کے لیے انقلابی خواہشات کیساتھ رخصت کیا۔ گروپ ایک سیاسی تنظیم کے قیام کے لئے سوچ بچار کرنے لگا۔

جدوجہد انقلابی تحریک

نومبر 1994ء کی ایک کانگریس میں گروپ کو سیاسی تنظیم بنانے کا پروگرام پیش کیا۔ تنظیم کا نام ایک یوتھ میٹنگ میں ایک باہمت تیرہ سالہ نوجوان نے تجویز کیا۔ "جدوجہد انقلابی تحریک" جو کانگریس نے اتفاق رائے سے منظور کر لیا اور 26 اپریل 1995ء کے دن لاہور پریس کلب میں پریس کانفرنس کے ذریعے تنظیم کا اعلان کرتے ہوئے کہا "جیت" ایک انقلابی تنظیم ہے جو سوشلزم پر یقین رکھتی ہے یہ محنت کش طبقے کی اپنی تنظیم ہے جو آنے والے ہر الیکشن میں اپنے پلیٹ فارم سے حصہ لے گی۔" 1994ء سے 1997ء تک "جیت" نے نجکاری کے خلاف بھرپور مہم جاری رکھی۔ اس دوران پاکستان بھر کی ٹریڈ یونین اور فیڈریشنوں نے کنفیڈریشن بنانے کا اعلان کیا جس میں ملک بھر سے سات فیڈریشنیں تھیں جس کو "جیت" نے خوش آمدید کہا اور کنفیڈریشن کے قیام کے بعد یوم مئی پر کنفیڈریشن کی ریلی میں ایک لیف لیٹ کے ذریعے پیغام دیا کہ ملک میں محنت کشوں کی کوئی اپنی طبقاتی پارٹی نہیں لہٰذا کنفیڈریشن کو ایک سیاسی پارٹی کی تشکیل کرنی چاہیے جس میں "جیت" خود کو ضم کر دے گی۔ 1997ء کے قومی انتخابات میں "جیت" نے 6 دیگر لیفٹ گروپوں اور پارٹیوں کے عوامی اتحاد تشکیل دے کر "جیت" کے تین ساتھیوں نے قومی انتخابات میں حصہ لیا۔

1986ء سے 1997ء تک جدوجہد گروپ سے "جیت" کی تعمیر تک تنظیم نے ایمپلائز پرائیویٹائزیشن ایکشن کمیٹی، ایمپلائز ورکرز کمیٹی اور لیفٹ الائنس کے ذریعے جدوجہد جاری رکھی۔ تحریک کو آگے بڑھایا اور خصوصی طور پر 1990ء جب سوویت یونین اور دیگر سوشلسٹ ریاستوں میں سرمایہ داری کی استواری ہوئی تو "جیت" اور مزدور جدوجہد نے سوشلسٹ نظریات کا ڈٹ کر دفاع کیا۔

"جیت" سے لیبر پارٹی کی جانب قدم

جدوجہد انقلابی تحریک (جیت) 1995ء سے 1997ء تک مختلف طبقاتی ایشوز پر تحریک منظم کرتے ہوئے پروپیگنڈا کرتی رہی کہ پاکستان کی ٹریڈ یونین جو کنفیڈریشن میں منظم ہیں وہ محنت کش طبقے کی پارٹی بنائیں۔ "جیت" کی پہلی کانگریس جو لاہور میں 3/4 مئی 1997ء میں منعقد ہوئی جس میں محنت کشوں کی اپنی پارٹی کا ایجنڈا پیش کیا گیا۔ جدوجہد انقلابی تحریک میں اس وقت اہم پیش رفت ہوئی جب سندھ سے بائیں بازو کے تجربہ کار ساتھی "جیت" میں شامل ہوئے تو تنظیم تیزی سے پھیلنے لگی۔ لیبر پارٹی کا قیام عمل میں تب ہی ممکن ہوا

جب بائیں بازو کے بہت سے ساتھی اس میں شامل ہوئے۔ لیبر پارٹی کو بنانے والے صرف "جدت" کے ساتھی ہی نہ تھے بلکہ بائیں بازو گروپوں اور پارٹیوں سے آنے والوں نے لیبر پارٹی کو تیز ترین ترقی کرنے والی پارٹی بنانے میں ایک اہم فیکٹر کے طور پر کردار ادا کیا۔

15 اکتوبر 1997ء میں لاہور اور کراچی سے بیک وقت پریس کانفرنس کے ذریعے لیبر پارٹی کے پروگرام اور لائحہ عمل کا اعلان کیا گیا۔ 1997ء سے 1999ء تک پارٹی طبقاتی تحریکوں اور مختلف طبقاتی ایشوز پر جدوجہد کرتی رہی۔ 1997ء میں چھوٹا سا دھڑا پارٹی سے الگ ہوا مگر پارٹی کی درست حکمت عملی نظریات کی پختگی اور پارٹی میں جمہوری روایت نے پارٹی کو مزید وسعت دی۔

لیبر پارٹی اور سماجی تحریکیں

گروپ 1992ء میں ہی محسوس کر لیا کہ جیسے ورکرز یک سوشلسٹ ریاستوں میں سرمایہ داری کی بحالی کے بعد دنیا بھر میں جو خلاء پیدا ہوا اس میں سماجی تحریکوں کو جگہ ملے گی، دنیا بھر میں سوشلسٹ تحریک کو دھچکے کے بعد بہت سے بائیں بازو کے لوگوں نے سماجی تنظیمیں بنا کر کام شروع کر دیا۔ گروپ سماجی تحریکیں بنا کر سوشلسٹ تحریک کو جاری رکھے جانے اور سماجی تحریکوں کی طرف رویہ دوستانہ ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس بعض بائیں بازو نے سماجی تحریکوں کو سامراجی ایجنڈا قرار دیتے ہوئے نفرت کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اس کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں رہے۔ گروپ نے سماجی تنظیموں کیساتھ مل کر امن ریلیاں اور خواتین حقوق بچوں کے حقوق کے لیے کام ہی نہیں کیا بلکہ 1993ء میں چائلڈ لیبر پر کام کرتے ہوئے محنت کش علاقوں میں چائلڈ لیبر سکول قائم کیے۔ کچی آبادیوں میں متحرک افراد کی شمولیت کے بعد گروپ نے ہوم بیسڈ ورکرز، لیپ لائن عورتوں کے حقوق کے لیے تنظیم منظم کرنے میں مدد دی۔ لیبر ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے قیام سے ٹریڈ یونین ریسورس سنٹر تعمیر کیا جس کے بعد نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن کا قیام 1999ء میں ہوا اور لیبر پارٹی نے اپنی قائم کردہ ڈیموکریٹک لیبر فیڈریشن اس میں ضم کر دی۔ اور پاکستان بھر مزدور یونین بنائی گئی۔ مذہبی جنونیت، عورتوں، بچوں، اقلیتوں کے خلاف خاص ماحول پایا جاتا تھا وہاں پر سماجی تنظیموں کی طرف ہمارے رویے اور نقطہ نظر کو حالات نے درست ثابت کیا اور یہی وجہ تھی کہ 1997ء میں ہی لیبر پارٹی پاکستان نے حکمت عملی بنائی کہ وہ شعبہ جاتی ونگ نہیں بنائے گی بلکہ آزادانہ طور پر ابھرنے والی مزدور کسان تحریکوں کی مدد و معاونت کرے گی اوکاڑہ میں ملٹری فارم کے کسانوں کی تحریک میں پارٹی نے بھرپور مداخلت کرتے ہوئے انجمن مزارعین پنجاب کی تحریک کو منظم ہونے میں مدد دی اور کسانوں کی تحریک میں حصہ لیا۔ 2004ء میں فیصل آباد میں پاور لوم ورکرز نے اپنی مدد آپ کے تحت لیبر قومی موومنٹ کی تشکیل کی تو پارٹی نے لیبر قومی موومنٹ کے ساتھیوں اور تحریک کا ہر مشکل وقت میں قدم سے قدم ملا کر ساتھ دیا۔

1997ء سے 1999ء

1997ء میں نواز شریف کو بھاری مینڈیٹ دیا گیا اور نواز شریف کو قائد اعظم ثانی اور بھٹو کے روپ میں میڈیا نے پیش کیا۔ نواز شریف کا دعویٰ تھا کہ وہ پاکستان کو کوریا بنا دیں گے جبکہ لیبر پارٹی کا پرچہ کہتا تھا کہ "نواز شریف نیو لبرل ایجنڈے پر چلتے ہوئے پاکستان کو کوریا نہیں ایتھوپیا بنائے گا، نواز شریف میں جو خوش فہمیاں ہیں وہ جلد دور ہو جائیں گی۔" پاکستان کے محنت کشوں کے مسائل کا کوئی حل نواز شریف کے پاس نہیں۔ نواز شریف نے اسی دوران میں ایٹمی دھماکے کر دیئے اور پاکستان کو مشکل میں پھنسا دیا اور خود وائٹ ہاؤس کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور پھر اکتوبر 1999ء میں جنرل مشرف نے نواز شریف کا تختہ الٹ دیا۔ ایک طرف نواز شریف کے جانے پر مٹھائیاں تقسیم ہو رہی تھیں، جماعت اسلامی، بینظیر، نوابزادہ نصر اللہ کی خاموش حمایت، عمران خان تحریک انصاف کی جنرل مشرف کو مکمل حمایت حاصل تھی جبکہ لیبر پارٹی نے جنرل مشرف کے مارشل لاء لگانے کی مخالفت کی اور نواز شریف کی جمہوری حکومت کو ختم کرنے کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ 21 تا 27 اکتوبر 1999ء کے "مزدور جدوجہد" کے ٹائٹل پر دو فوجی بوٹ اور سرخی تھی "مارشل لاء نامنظور" سب سرخی تھی "محنت کش فوجی آمریت کے خاتمے کی جدوجہد کا آغاز کریں"۔ اسی شمارے کے اداریے میں چوتھے مارشل لاء کو "سی ہوٹل پرانی شراب" لکھا گیا۔ اسی شمارے کے صفحہ نمبر 4 تیسرے پیراگراف میں مشرف آمریت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا گیا۔ "لیبر پارٹی کا یہ موقف رہا ہے کہ نواز حکومت پانچ سال پورے نہیں کر پائے گی اور ایک نئی جمہوری حکومت اقتدار میں آ سکتی ہے۔ جو شاید سب سے زیادہ عرصہ اقتدار میں رہ کر احتساب کے نام پر سیاسی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے جو کام آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ایجنڈے کے مطابق نواز حکومت نہ کر سکی وہ کام اس جمہوری حکومت سے کروانے کی کوشش کی جائے گی۔ فوجی آمریت کے قیام سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ حالات اس سے زیادہ خراب ہیں جتنا کہ ہم جائزہ لے رہے تھے۔ موجودہ صورتحال سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کام جمہوری حکومت کرنا چاہتی تھی وہ کام اب مارشل لاء کے ڈنڈے سے لیا جائے گا۔ یعنی احتساب کے نام پر سیاسی آمدنی کو بڑھانے کے اقدامات تاکہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو خوش رکھا جائے۔"

21 تا 27 اکتوبر 1999ء کے شمارے کے مارکیٹ میں آ جانے کے بعد فوجیوں نے بھر اٹیک کے ذریعے لیبر پارٹی کے پریس پر چھاپہ مارا اور مزدور جدوجہد کی کاپیاں اٹھا لیں۔ اس دوران ہیومن رائٹس اور سول سوسائٹی کے سرکردہ رہنما لیبر پارٹی کے دفتر پہنچ گئے۔ لیبر پارٹی کسی خوف میں نہ آئی اور مارشل لاء کے خلاف جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی۔

اپریل 2000ء میں لیبر پارٹی پاکستان کی پہلی کانگریس لاہور میں منعقد ہوئی اور لیبر پارٹی نے مشرف کے ریفرنڈم کے خلاف بھرپور مہم چلائی۔ مشرف کے ڈھونگ ریفرنڈم کے حق میں ایک طرف جماعت پاکستان

پر تحریک انصاف، طاہر القادری کی عوامی تحریک جلسہ کررہی تھیں اور لیبر پارٹی نے ڈھونگ ریفرنڈم کے خلاف بائیکاٹ کی اپیل کرتے ہوئے لاہور پریس کلب کے باہر گرفتاریاں دیں۔ لیبر پارٹی کے 18 ساتھیوں نے احتجاجی گرفتاریاں دیں۔

2001ء میں لیبر پارٹی اتحاد برائے بحالی جمہوریت میں شامل ہو کر آمریت کے خلاف مزاحمت کو تیز کرتی رہی۔ یکم مئی کے دن لیبر پارٹی کے جنرل سیکرٹری کو اور سے آزادی کی قیادت کو لاہور کے ایئرپورٹ سے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ نشتر پارک کراچی میں ہونے والے ARD کے جلسہ میں جانے والے تھے۔ اس سے پہلے لاہور کے موچی دروازہ میں ARD کے جلسہ کے موقع پر لیبر پارٹی کی نازلی جاوید، عذرا شاد سمیت 10 ساتھیوں نے گرفتاری دی اور جمہوریت کے بحالی کے لیے قربانیاں دیتے ہوئے جدوجہد جاری رکھی۔

لیبر پارٹی کی دوسری کانگریس 22-23 مارچ 2003ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ پارٹی کو نئی توانائیاں اور اعتماد کو از سر نو بحال کرنے کے لیے لیبر پارٹی نے ہنگامی تیسری کانگریس بلانے کا اہتمام کیا اور 4-5 دسمبر 2004ء کو لاہور میں لیبر پارٹی کی تیسری کانگریس منعقد ہوئی۔ تیسری کانگریس کے بعد جدوجہد کی نئی مثالیں سامنے آئیں۔

2004ء سے 2007ء ایک مزاحمتی دور

2006ء میں پارٹی بائیں بازو کی چھ جماعتوں اور گروپ پر مشتمل بائیں بازو کے اتحاد عوامی جمہوری تحریک میں شامل ہوئی۔ 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی برطرفی کے بعد لاہور میں وکلاء پر ہونے والے لاٹھی چارج کے خلاف مظاہرہ کیا جو وکلاء پر ہونے والے لاٹھی چارج کے خلاف پہلا احتجاج تھا۔

2007ء کے آنے پر وکلاء تحریک شروع ہوئی۔ یہی سال لیبر پارٹی کی چوتھی کانگریس کا انعقاد ہونے والا تھا۔ کانگریس کی تاریخ اور مقام ٹوبہ ٹیک سنگھ طے کیا گیا مگر وکلاء تحریک میں جدوجہد اور گرفتاریوں کے عمل سے کانگریس ملتوی کرنا پڑی۔ آخرکار پارٹی کی چوتھی کانگریس کا انعقاد 8-9 دسمبر 2007ء میں ممکن ہوا۔

8-9 دسمبر 2007ء میں لیبر پارٹی کی چوتھی کانگریس تک پارٹی کے اسٹرکچر میں تبدیلیاں لائی گئیں۔ طے پایا کہ آئندہ کوئی بھی ساتھی دو ٹرم سے زیادہ کسی عہدہ پر منتخب نہیں ہو سکتا۔ نثار شاہ ایڈووکیٹ کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ اس کانگریس میں پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے میں بھی تبدیلیاں منظور کی گئیں جس کے مطابق پارٹی کے عہدیدار روایتی طرز پر نہیں بلکہ شعبہ جاتی سیکرٹری ہوں گے جن میں (۱) جنرل سیکرٹری، (۲) ویمن سیکرٹری، (۳) کسان سیکرٹری، (۴) یوتھ سیکرٹری، (۵) لیبر سیکرٹری، (۶) ایجوکیشن و کلچرل سیکرٹری اور یہ عہدیدار مرکز سے یونٹ کی سطح تک ہوں گے۔

لاہور سے جدوجہد گروپ کا آغاز 1986ء سے ہوا۔ اسی شہر میں بینک ورکرز کا قیام عمل میں آیا اور اسی

شہر میں جدوجہد انقلابی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی اور پھر 1997ء میں اسی شہر میں جیت کی کانگریس میں لیبر پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ لیبر پارٹی پنجاب کی تیسری کانگریس 20 اپریل 2008ء میں ہوئی۔ اسی سال پنجاب کو دو صوبائی اکائیوں میں تقسیم کرتے ہوئے سرائیکی وسیب کی کانگریس کا فیصلہ کیا گیا۔

لیبر پارٹی کی تعمیر کے لئے سندھ میں ساتھیوں سے رابطے تو بینک ورکرز تنظیم کے طور پر تھے پھر 1998ء میں لیبر پارٹی سندھ کانفرنس بھٹ شاہ میں منعقد ہوئی۔ لیبر پارٹی بائیں بازو کی متحرک تنظیم کے طور پر تعمیر ہونے لگی۔ 2008ء میں سندھ لیبر پارٹی کی تیسری کانگریس کا انعقاد ہوا تو حیدرآباد سے بائیں بازو کے ایک بڑے گروپ نے لیبر پارٹی میں شمولیت اختیار کی جن میں عاصم اخوند بھی شامل تھے۔ عاصم اخوند اور ان کے ساتھیوں کی شمولیت سے لیبر پارٹی سندھ میں بائیں بازو کی متحرک نظریاتی پارٹی کے طور پر ابھری۔ عاصم اخوند 2008ء میں کینسر کی بیماری کی وجہ سے جدوجہد کرتے ہوئے ہم سے جدا ہو گئے۔ ساتھی اخوند سندھ کے معروف بائیں بازو کے تجزیہ کار تھے۔ سندھ لیبر پارٹی سندھ کے تیرہ شہروں میں موجود ہے۔

1994ء میں پختونخواہ میں بائیں بازو کے ساتھیوں کو بائیں بازو کے گروپوں میں کام کرنے والے ساتھیوں سے رابطے مضبوط ہوتے چلے گئے۔ مگر لیبر پارٹی میں شامل نئے ساتھیوں نے دن رات کی محنت سے پارٹی کو پھیلانے میں کردار ادا کیا اور لیبر پارٹی پختون خواہ کی دوسری کانگریس کا انعقاد پانچ جون 2006ء میں ہوا۔ سرحد پارٹی نے ٹریڈ یونین اور خواتین تنظیموں سے مل کر لیبر پارٹی کو پختون خواہ میں بائیں بازو کی ایک بڑی پارٹی بنا دیا۔

لیبر پارٹی سرائیکی وسیب کی پہلی کانگریس 25 اپریل 2008ء میں منعقد ہوئی، جس میں گیارہ اضلاع سے سو سے زائد ساتھیوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر پارٹی کا موقف پیش کرتے ہوئے کہا گیا ''سوشلسٹ ہر قسم کے استحصال کے خلاف ہیں خواہ وہ قومی بنیادوں پر یا خواتین کی بنیادوں یا اقلیتوں کے خلاف ہو۔ لیبر پارٹی پاکستان میں بسنے والی تمام قوموں اور محروم طبقات کے حقوق کی علمبردار ہے۔ وسائل و اختیارات اور آبادی کے اعتبار سے پنجاب کی بالادستی کے نتیجہ میں چھوٹے صوبوں اور قوموں میں بے چینی اور وفاق پر عدم اطمینان میں اضافہ ہوا۔ صوبوں کے مابین اختیارات سے لے کر قدرتی وسائل جیسے مسائل معاملات حل طلب ہیں۔ حکمرانوں کا تعلق جن کی اکثریت کا تعلق پنجاب کے بالادست طبقات سے رہا ہے جو دوسری قوموں کا استحصال بھی کررہے ہیں۔ سرائیکی جو کہ اپنی شناخت اور بود و باش، تہذیب، تاریخ اور جغرافیائی حیثیت کے اعتبار سے ایک الگ قوم ہے۔ سرائیکی خطہ میں بالادست طبقات جاگیردار وڈیرا روایتی پاکستان کے حکمرانوں کے ساتھ اتحاد میں رہے اور سرائیکی محنت کش عوام کا استحصال کررہے ہیں۔ ان حالات میں لیبر پارٹی سرائیکی وسیب کے نام پر پنجاب کو دو صوبائی اکائیوں میں تقسیم کرتے ہوئے سرائیکی صوبائی کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کرتی ہے اور ملتان، لیہ، خانیوال، لودھراں، ڈی جی خان،

بہاولنگر، مظفرگڑھ، جھنگ، راجن پور، میانوالی، بھکر، رحیم یار خان، وہاڑی کے اضلاع کو مرائیکی وسیب کا دائرہ کار سمجھتی ہے جسے بعد میں ساتھیوں کی مشاورت سے مزید منظور کیا جائے گا۔

لیبر پارٹی بلوچستان میں رابطے نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن نے وسیع کیے جبکہ 1997ء سے پارٹی کی ممبر شپ وہاں موجود تھی۔ لیبر پارٹی بلوچستان کی پہلی کانگریس بلوچستان کے شہر جعفرآباد میں 8 دسمبر 2009 کو منعقد ہوئی جس میں 21 رکنی صوبائی کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا۔ لیبر پارٹی بلوچستان کے 10 اضلاع میں موجود ہے اور اپنی تعمیر کے ابتدائی مراحل میں ہے۔ اس کے علاوہ بلتستان اور کشمیر میں پارٹی کی تعمیر جاری ہے۔

لیبر پارٹی کو صدمات

گلزار حیات گلگتی شہید

یکم اور دو جون 1996 کی درمیان ''جدت'' کے ساتھی اور ٹیکسٹائل ملوں میں ٹریڈ یونین منظم کرنے والے ساتھی گلزار حیات گلگتی کو نامعلوم لوگوں نے پارٹی کے مرکزی سیکرٹریٹ میں شہید کردیا۔ ڈاکو لیبر پارٹی کے اثاثہ جات چوری کرنے کے لیے آئے۔ گلزار حیات جو کہ پارٹی آفس میں ہی رہائش پذیر تھے نے ڈاکوؤں سے مزاحمت کی۔ لیبر پارٹی اپنی پانچویں کانگریس کے موقع پر گلزار حیات کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔

مشتاق گورایہ

لیبر پارٹی پاکستان پنجاب کے جنرل سیکرٹری مشتاق گورایہ جولائی 2004ء میں پارٹی کے سمر کیمپ کے دوران دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

عبداللہ قریشی

صوبہ پختونخواہ میں پارٹی کے اور بائیں بازو کے سینئر رہنما عبداللہ قریشی دسمبر 2007ء میں بم دھماکے میں شہید ہوئے جنہوں نے سوات میں پارٹی کا پرچم بلند رکھا۔ پارٹی ان کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔

ماسٹر خداداد

ماسٹر خداداد پختونخواہ پشاور سے تھے جنہوں نے پختون خواہ کے ٹریڈ یونین حلقوں میں پارٹی کو متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا وہ نومبر 2009 میں ایک خودکش دھماکے میں شہید ہوئے۔

بلوچستان میں حادثہ

لیبر پارٹی اس وقت بڑے صدمے سے دوچار ہوئی جب 13 دسمبر کو نصیر آباد بلوچستان سے کراچی آتے ہوئے ساتھی عبدالسلام سلام، ریحانہ کوثر، نجمہ خانم اور واحد بلوچ روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات پا گئے۔ یہ پارٹی کی تاریخ میں بڑا افسوسناک واقعہ ہے جس نے پوری پارٹی کو شدید متاثر کیا۔ ان ساتھیوں کی جدوجہد اور متحرک کردار کو کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ پارٹی ان تمام ساتھیوں کی جدوجہد کو سرخ سلام پیش کرتی ہے۔

پارٹی نے ان تمام ساتھیوں کیلئے 30 لاکھ فنڈ کی اپیل جاری کی ہے سندھ کے ساتھیوں نے 6 لاکھ روپے فنڈ اکٹھا کر لیا ہے تمام ساتھیوں سے اپیل ہے کہ پارٹی نے جو 30 لاکھ فنڈ کا ہدف رکھا ہے پارٹی کے ہمدردوں ممبروں سے ملک اور بیرون ملک اپیل ہے کہ وہ ٹارگٹ کو پورا کرنے کے لیے فنڈ دیں۔

عاصم اخوند:

لیبر پارٹی پاکستان کی مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر اور یوتھ سیکرٹری عاصم اخوند ستمبر 2008ء میں دل کے مرض کی وجہ سے 32 سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔

☆☆☆